ماہ نامہ

قومی زبان

جون ۲۰۲۵ء کراچی

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C, Latifabad, Hyderabad.

انجمن ترقی اردو پاکستان



بانی: بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق
جاری شدہ: ۱۹۴۸ء

مدیرِ منتظم

سید عابد رضوی

مجلسِ مشاورت

زاہدہ حنا
واجد جواد
پروفیسر ڈاکٹر شاداب احسانی

مدیر

پروفیسر ڈاکٹر یاسمین سلطانہ فاروقی

معاون

سیّد علی حسن

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C, Latifabad, Hyderabad

فی پرچہ: ۲۵۰ روپے
سالانہ (صرف رجسٹری سے): ۳۵۰۰ روپے
سالانہ (ہوائی ڈاک سے) ۵۰ پونڈ/ ۱۰۰ ڈالر
کتب و رسائل کی خریداری کے لیے منی آرڈر/ بنک ڈرافٹ بنام
انجمن ترقی اردو پاکستان ارسال کیجیے۔

انجمن ترقی اُردو پاکستان
شعبۂ تحقیق و تالیف و تصنیف
اُردو باغ، ایس ٹی۔ ۱۰، بلاک ۱، گلستان جوہر، کراچی
رابطہ: ۰۲۱-۳۴۱۶۱۱۴۳ شعبۂ فروخت: ۰۳۳۲-۲۷۹۰۸۴۳
atup.khi@gmail.com http://www.atup.org.pk

سید ایف ایچ عابد رضوی، مدیر منتظم نے انجمن ترقی اُردو پاکستان، اردو باغ، کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

فہرست

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C, Latifabad, Hyderabad

اداریہ

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C, Latifabad, Hyderabad.

علم و ادب کا سفر کبھی رُکتا نہیں بلکہ صدیوں سے جاری و ساری ہے۔ تلاش و جستجو میں رہنے والے ذہنوں نے جہاں سے بھی علم و حکمت کے موتی ملے، چُن لیے۔ نئی راہیں تلاش کیں، ایجادات کیں اور اپنی روشن خیالی کو راہ نما بنا کر، جہل کی تاریک راہوں کو منور کرنے کے لیے علم و عمل کے ایسے چراغ جلائے کہ وقت کی آندھیاں بھی ان کو نہ بجھا سکیں۔

ہمارے سامنے اپنے اسلاف کی بے شمار مثالیں موجود ہیں جنھوں نے بحیثیت حکمران، استاد، سائنس دان یا دانش ور ہوتے ہوئے بھی جدید علوم سیکھنے، ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کے لیے سفر کیے، مختلف ممالک کے کتب خانوں سے استفادے کیے اور ایک عالم کو متاثر کیا۔ اسی فکر کو لے کر ان کے معاصرین و معتقدین آگے بڑھے اور علم و دانش کے دیپ جلائے جن کی بدولت آج بھی درس گاہوں کے بام و در روشن ہیں۔

بالکل اسی طرح ہر عہد میں ادب کی مختلف تحریکوں اور نظریات نے اپنی جگہ بنائی اور ان کا ایک مخصوص حلقہ پیدا ہوا۔ جیسے کہ آج سے چند عشرے قبل ترقی پسند تحریک بنی، اس کے بعد جدید ادبی تحریک نے اپنی جگہ بنائی۔ ان تحاریک و نظریات نے کامیابیاں حاصل کیں۔ ان کے ساتھ مختلف قسم کے ادبی رجحانات بھی شامل ہوتے چلے گئے اور ادب کو مزید تقویت ملتی چلی گئی۔ نئے قلم کار منظرِ عام پر آئے، ادبی مباحث چھیڑے گئے، مغربی مفکرین و ادیب زیرِ بحث آئے، جدیدیت، مابعد جدیدیت پر گفتگو ہونے لگی۔ دوسرے ممالک کا ادب زیرِ بحث آیا اور اس طرح ایک ادبی فضا بنتی چلی گئی جو اب بھی جاری ہے جس نے ہمارے ادبی منظرنامے میں نئے رجحانات کو فروغ دیا اور قدیم و جدید کے اس سنگم نے فکر و دانش کے نئے در وا کیے۔ مقامی ادیب و دانش وروں کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی مفکرین سے بھی سنجیدگی سے استفادہ کیا جانے لگا۔ موجودہ عہد میں ادب کی صورتِ حال دیکھتے ہوئے لگتا ہے کہ ہمارے ادب پر جمود طاری ہوتا جا رہا ہے۔ نامی گرامی اساتذۂ فن کے یکے بعد دیگرے گزرنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی جگہ لینے والے لوگ کم ہیں اور ہمیں قحط الرجال کا سامنا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اساتذہ و طلبہ ان باتوں کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لے رہے۔ مطالعے اور معیاری تحقیق میں کمی ہونے کی وجہ سے قابلِ قدر کام سامنے نہیں آ رہا۔

اس بات کا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ آج کے طلبہ اس طرف زیادہ توجہ نہیں دے رہے۔ ان کا تحقیقی کام بہت سطحی نوعیت کا ہے۔ اعلیٰ

ڈگریوں کے حوالے سے ہم ہمیشہ اہلِ دانش وبینش کی توجہ مبذول کرواتے رہتے ہیں کہ تحقیق کے معیار کو بلند کرنا بہت ضروری ہے۔ مرتّبہ کتابوں کی تعداد بڑھ رہی ہے اور تحقیقی وطبع زاد کتب میں بالعموم معیار اور جدت دونوں کا فقدان نظر آتا ہے۔ ہمارے ادارے انجمن ترقی اردو میں چوں کہ اشاعت کے لیے کتابیں بھیجی جاتی ہیں تو یہی دیکھا گیا ہے کہ صرف طلبہ ہی نہیں اساتذہ اور نگرانوں کو بھی اس طرف سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے پاس بہترین ادیب و محقق نہ پیدا ہوں۔

گرمی کی حدت اپنے عروج پر ہے اور ہم عیدالاضحیٰ کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ یہ مہینا ہمیں ایثار وقربانی کا درس دیتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی سنت کی پیروی میں کی جانے والی جانوروں کی قربانی صرف ایک رسم نہیں ہے بلکہ اس میں جذبۂ ایثار وفرماں برداری کا درس موجود ہے جس کی ہمیں بہت ضرورت ہے۔ ہمارا معاشرہ اخلاقی طور پر تباہی کی سمت گامزن ہے۔ مالی بے ضابطگیاں، اقربا پروری، فرائض سے بددیانتی اور لوٹ کھسوٹ وغیرہ عام ہے۔ ہم اپنے فرائضِ منصبی سے غافل ہیں اور چند روزہ نشاط کی گھڑیاں پانے کے خاطر اپنے اصول وضوابط اور اخلاقی قدروں کو داؤ پر لگائے ہوئے ہیں جن کے نتائج یقیناً بہت خراب ہوں گے۔ اس لیے ان تیزی سے گزرتے شب وروز کو مثبت سوچ اور دیانت داری سے گزاریں تاکہ دنیا و آخرت کی بھلائیاں پاسکیں۔

قارئین کو عیدالاضحیٰ کی مبارک باد۔

(ی س ف)

توجہ فرمائیے!

ماہ نامہ ''قومی زبان'' کے لیے اپنا مضمون بھجوانے سے قبل:

۱۔ مضمون کی پروف خوانی توجہ سے کی جائے۔
۲۔ اشعار کی صحتِ لفظی کا خیال رکھتے ہوئے اصل کلام سے موازنہ کیا جائے نیز ان کے مکمل حوالے درج کیے جائیں۔
۳۔ مضمون سے اوپر دائیں جانب اپنے نام کے ساتھ ساتھ اپنا عہدہ/ پیشہ، پتا، فون اور برقی پتا بھی درج کیجیے۔
۴۔ ''قومی زبان'' میں شاعری، افسانے وغیرہ شائع نہیں کیے جاتے۔
۵۔ مضمون میں ذکر کی گئی کتابوں، رسالوں کے نام اور مضامین کے عنوانات واوین ('' '') میں دیے جائیں۔
۶۔ مضمون کے حواشی ذیل میں دی گئی مثال کے مطابق درج کیجیے:

مثال: عبادت بریلوی، ''تنقیدی زاویے''، مکتبۂ اردو، لاہور، ۱۹۵۱ء، ص ۲۱۶

ڈاکٹر صابر حسین جلیسری ٭

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C, Latifabad, Hyderabad.

علامہ شبلی نعمانی کی تصنیف ''موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ'' پر اک نظر

علامہ شبلی نعمانی کی علمی و ادبی تصانیف میں ان کی کتاب ''موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ'' کو علمی و ادبی اعتبار سے منفرد مقام حاصل ہے۔ شاعرانہ تنقید کی یہ پہلی کتاب ہے جو عربی اور فارسی کے تنقیدی اصولوں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ علامہ شبلی نے اس کتاب کو گو عقیدت مندانہ اسلوب میں لکھا ہے، پھر بھی اردو ادب میں اس کتاب کی اہمیت مسلمہ ہے۔ یہ کتاب اپنے وقت کے دو ایسے نامور شعرا پر لکھی گئی ہے جنھوں نے اپنے کلام کی انفرادیت کے ذریعے ایک نئی صنف ''مرثیے'' کو ادب میں اعتبار بخشا اور اپنی شاعری کے ذریعے شاعری کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ اس لیے اس کتاب کو علمی اور ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ملی۔ اس کتاب کی تحقیقی، تنقیدی اور عقیدت مندانہ کاوشوں پر نکتہ چینی بھی کی گئی، تاہم ادب میں اس کتاب کی اہمیت ہمیشہ قائم رہی۔

''موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ'' ہم نے پہلی مرتبہ اپنے طالب علمی کے دور میں پڑھی تھی۔ یہ کتاب ہمارے نصاب میں شامل تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں پڑھی جانے والی علمی و ادبی کتابیں بعض اوقات ذہن پر بار محسوس ہوتی ہیں کیوں کہ فہم و ادراک پر یہ احساس چھایا رہتا ہے کہ اس میں سے سوال آئیں گے، ان کے جواب لکھنے ہوں گے۔ دیکھو کیا ہوتا ہے، کتنے نمبر ملتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ نفسیاتی دباؤ طالب علم پر کتاب کے ادبی پہلو کو اس طرح اجاگر نہیں ہونے دیتا جس طور کوئی ادیب یا نقاد پڑھتا ہے۔ اس زمانے میں اس کتاب کے ساتھ کچھ ہمارا بھی یہی طور رہا۔ ہم نے اس زمانے میں اسے دلچسپی سے پڑھا مگر ہماری دلچسپی کا کُل محور میر انیسؔ کی شاعری، ان کا سادہ بیان اور ردیف کی گھلاوٹ، موسیقیت اور غنایت میں گھرے رہے اور کہتے رہے میر انیسؔ بے مثال شاعر ہیں اور تقریباً اسی نقطۂ نظر سے ہم نے امتحان میں اس سے متعلق سوال کا جواب بھی لکھا۔ اور امتحان پاس کرلیا۔ پھر بحیثیت مدرّس میر انیس کو پڑھایا بھی اور خوب پڑھایا۔ اور ایسے وجد کے عالم میں پڑھایا کہ طلبہ عش عش کر اٹھے۔ میر انیسؔ کے مراثی پڑھانا قطرے کو سمندر سے ملا دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ اب جبکہ ہم کہن سالی کا اوڑھنا اوڑھ چکے ہیں اور گھر میں پڑے پڑے مجموعۂ کتب سے نکال کر کوئی نہ کوئی کتاب پڑھتے رہتے ہیں، پچھلے دنوں کتابوں کی الماری دیکھی تو ''موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ'' ہاتھ لگ گئی۔ پڑھنا شروع کیا۔ اب جو کچھ پڑھتے ہیں سمجھ کر پڑھتے ہیں، سیکھنے کے لیے پڑھتے ہیں تاکہ ادبی نس کا پورا پورا لطف حاصل ہو۔

''موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ'' کے مطالعے سے احساس ہوا کہ علامہ صاحب نے مرزا دبیرؔ کے ساتھ کچھ انصاف نہیں کیا۔ ہمیں بھی یہ سوچنا پڑا یہ کتاب موازنے سے زیادہ مناقب کی کتاب ہے۔ یہ ترکیب خود علامہ شبلی نعمانی نے مولانا حالی کی تصنیف ''حیاتِ جاوید''

٭ سابق صدر، شعبۂ اردو، ڈی ایچ اے ڈگری کالج، کراچی۔

کے بارے میں کہی تھی۔ ہوا یوں تھا کہ سرسیّد احمد خاں کی وفات کے بعد مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی مشہور کتاب ''حیاتِ جاوید'' تصنیف کی۔ طباعت کے فوراً بعد پہلا نسخہ علامہ کی خدمت میں بھجوایا کیوں کہ علامہ کا اور سرسیّد کا علی گڑھ اسکول کے حوالے سے گہرا ساتھ رہا تھا اور دونوں میں علمی مباحث ہوتے رہتے تھے۔ شبلی سرسیّد سے عمر میں چھوٹے تھے مگر علمی قابلیت میں سرسیّد اُن سے مرعوب رہتے تھے۔ اس رشتے اور تعلقِ خاطر کے سبب حالی نے سمجھا کہ ''حیاتِ جاوید'' دیکھ کر شبلی خوش ہوں گے، ان کی کوششوں کو سراہیں گے مگر برخلاف ان تمام خیالات کے ان کا بیان ہے کہ جن صاحب کے ہاتھ کتاب شبلی صاحب کی خدمت میں ارسال کی گئی تھی انھوں نے آکر حالی کو بتایا کہ کتاب ہاتھ میں لے کر علامہ نے ''ناک بھوں چڑھائی'' اور کتاب سرد مہری کے ساتھ میز پر ڈال دی اور فرمایا کہ اس میں مجھے معلوم ہے، کیا لکھا ہے۔ یہ سوانح عمری نہیں ہے ''کتابِ مناقب'' ہے۔ چوں کہ اس کتاب میں جو تقریباً تین سو صفحے کی کتاب ہے، ڈیڑھ سو صفحات شبلی صاحب نے میر انیس کی مداحی میں کالے کر دیے ہیں اور یہاں مقابلتاً کہیں مرزا دبیرؔ کا ذکر ہی نہیں ہے۔

کتاب کے اس حوالے کے بعد اب اس کتاب کے فنی پہلو پر نظر ڈالنی چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب لکھتے وقت شبلی کے ذہن میں عربی زبان اور فارسی زبان کی شاعری کے فنی نکات اور نقد ونظر کے اثرات سمائے ہوئے تھے، موازنے کی تصنیف میں یہ اثرات ہمیں محسوس ہوتے ہیں۔ خاص طور پر علامہ نے فنِ ابلاغ پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ ان کی تحقیق کا یہ پہلو بہت مضبوط ہے۔ شبلی سے قبل کسی نقاد نے ''تسہیل البلاغہ'' کو کبھی مدنظر نہیں رکھا۔ علامہ شبلی پہلے نقاد ہیں جنھوں نے مرثیے کی شاعری پر بحث میں فنِ بلاغت کے تمام پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ فصاحت، بلاغت، تشبیہ، استعارہ، کنایہ، مراعات النظیر، حسنِ تعلیل، ابہام، لف ونشر اور دیگر فنی نکات کی تعریف بیان کی ہے مگر ان کی کتاب میں یہ سب تحقیقی پہلو میر انیسؔ کے حوالے سے بیان ہوئے ہیں، یہاں انھوں نے مرزا دبیرؔ کے کلام کا کوئی جواز پیش نہیں کیا۔ بلاشبہ اس سے پہلے شاعری کی ان فنی خوبیوں کی طرف کسی محقق یا نقاد نے توجہ نہیں دی تھی۔ یہ علامہ شبلی کی سوچ اور فکر کا اہم پہلو ہے۔ انھوں نے کتاب کی تمہید میں بعض تنقیدی اور تحقیقی پہلو پیش کیے ہیں۔ انھوں نے کتاب کی تمہید میں اردو شاعری کے بارے میں لکھا:

''میر تقی میرؔ کی غزلیت اور دردؔ کا تصوف اور غالبؔ کا فلسفہ شاعری کی جان ہیں۔''

''میر انیسؔ کا کلام شاعری کے تمام اصناف کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے۔''

شبلی نے اپنی کتاب کی تمہید میں اس نکتے کو بھی واضح کر دیا ہے کہ شاعری کیا ہے۔ چوں کہ آج کی ادبی محفلوں اور ادبی مباحث کے دوران بھی یہ سوال بار بار اٹھتا ہے کہ شاعری کیا ہے۔ انھوں نے اس بارے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

> شاعری کیا چیز ہے؟ یہ ایک نہایت مفصل اور دقیق بحث ہے... صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ شاعری کے دو اجزا ہیں: مادّہ وصورت یعنی کیا کہنا چاہیے اور کیوں کر کہنا چاہیے۔ انسان کے دل میں کسی چیز کے دیکھنے، سننے یا کسی واقعے یا حالت کے پیش آنے سے جوش ومسرت، عشق ومحبت، درد و رنج، فخر و ناز، حیرت و استعجاب، طیش وغضب وغیرہ وغیرہ کی جو حالت پیدا ہوتی ہے، اس کو جذبات

سے تعبیر کرتے ہیں، ان جذبات کا ادا کرنا شاعری کا اصلی ہیولیٰ ہے۔اس کے علاوہ عالمِ قدرت کے مناظر مثلاً گرمی سردی، صبح شام، بہار وخزاں، باغ و بہار، وحشت وصحرا، کوہ و بیاباں کی تصویر کھینچنا، ان کے اثرات اور حالات کا بیان کرنا بھی اسی میں داخل ہے۔ (تمہید ص ۳ تا ۵)

آگے چل کر شبلی صاحب نے اس کتاب کے عنوان کے بارے میں بھی بتا دیا:

اس کتاب میں میر انیسؔ کا موازنہ بھی مرزا دبیرؔ سے کیا گیا ہے اور اس مناسبت سے اس کا نام موازنہ ہے۔ (ایضاً، ص ۴)

''موازنہ'' عربی زبان کا لفظ ہے۔اس کے معنی ہیں برابر ناپنا یا تولنا یعنی ترازو کے دونوں پلڑے برابر۔قرآنِ مجید میں یہ لفظ بار بار آیا ہے۔مگر اس کتاب کے مطالعے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے انیسؔ اور دبیرؔ کے معاملے میں ترازو کے دونوں پلڑوں میں برابری بجائے کانی رکھی ہے کیوں کہ اس تمام کی تحقیق وتنقید میں ان کا سارا زور میر انیسؔ کی مدح سرائی میں صرف ہوا ہے اور تحقیق وتنقید کا پورا زور انھوں نے میر انیسؔ کے کلام کے محاسنِ بیان کرنے پر ہی لگایا ہے۔ حالاں کہ وہ بحرِ تحقیق کے سب سے بڑے شناور تھے، انھوں نے ''الفاروق''، ''المامون''، ''الغزالی'' جیسی اعلیٰ پائے کی تحقیقی کتابیں لکھی ہیں۔ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ایران اور مصر کے بڑے بڑے کتب خانے کھنگال ڈالے تھے۔وہ مصر گئے، وہاں چھ ماہ جامعہ ازہر کے کتب خانے سے استفادہ کرتے رہے۔وہاں وہ عربی ادب گھول کر پی گئے۔عربی زبان کے قدیم ادب کو خوب پڑھا۔اس کی ہیئت، منطق اور نفسیات کو سمجھا۔ وہ شاعری کی روایتی، تہذیبی، نفسیاتی اور تاریخی قدروں سے بھی خوب واقف ہوں گے۔اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے قرآنِ حکیم کی سورۃ الشعرا کے حوالے سے قدیم عربی ادب پر ضرور غور کیا ہوگا۔خاص طور سے قدیم شاعری کے بارے میں جو اس سورۃ کی آیتِ کریمہ کے بارے میں نکات سامنے آتے ہیں، وہ ضرور اُن کے پیشِ نظر رہے ہوں گے۔ہم عام قارئین کے لیے اس حوالے سے بتا دیں کہ قرآنِ مجید میں شاعری کا پس منظر کیا سامنے آتا ہے۔

سورۃ الشعرا میں فرمایا گیا ہے، ''رہے شعرا تو اُن کے پیچھے بہکے ہوئے لوگ چلا کرتے ہیں۔'' (آیت ۲۴)

واضح رہے کہ قرآن جس زمانے میں نازل ہوا، انسانی معاشرہ فسق وفجور اور لذت پرستی میں ڈوبا ہوا تھا۔ظاہری حسن وعشق دماغوں پر چھایا ہوا تھا۔زبان دانی کا شعور اور بلاغت کا وفور بھی سرمایۂ فخر تھا۔ایسے انسانی جذبات کا اظہار عرب شاعری کے ذریعے کیا کرتے تھے۔اس معاملے میں صنفِ نازک مع اپنے عشق و ناز کے موضوع رہتی تھی، اس کے بیان میں سفلی جذبات اثر دکھاتے تھے۔ سیرت کی کتابوں میں بھی اس دور کی شاعری کا ذکر موجود ہے کہ وہ لوگ صنفِ نازک کے خدوخال کو بے باکی سے بیان کرتے تھے جنھیں سننے والے رغبت سے سنتے اور شاعر کو داد دیتے تھے۔ایسے لوگوں کو ''بہکے ہوئے لوگ'' کہا گیا ہے۔اس کی تشریح میں لکھا گیا ہے، ''یا تو عشق بازی کے مضامین ہوتے یا شراب نوشی کے یا قبائلی منافرت یا جنگ وجدل کے یا نسلی فخر وغرور۔نیکی اور بھلائی کی باتیں ان میں بہت ہی کم پائی جاتی تھیں۔جھوٹ، مبالغہ، بہتان، ہجو، تعریف، ڈینگ، پھبتیاں اور مشرکانہ خرافات تو شاعری کی رگ رگ میں پیوست تھیں۔''

شاعری کے بارے میں یہ طویل محاکمہ ہم نے اس لیے نقل کیا ہے کہ آج کے دور میں بار بار پوچھا جاتا ہے کہ شاعری کیا ہے۔
ہماری اس بحث سے یہ تو واضح ہوگیا کہ شاعری کیا ہے۔

میر انیسؔ نے موازنے کی تصنیف کے دوران اپنے مطالعے، اثرات بھی اس میں سمائے ہیں مگر جیسا کہ ان کی کتاب کے مطالعے سے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اس صنف میں صرف میر انیسؔ ہی کے کلام کو پیشِ نظر رکھا مرزا دبیرؔ کے کلام کو اتنی اہمیت نہیں دی۔

موازنے کا اصول یہ ہے کہ ہر دو فریق کا کلام متقابل رکھا جائے تاکہ قاری ایک ہی لمحے میں دونوں کا برجستہ مقابلہ کرلیں۔ مگر علامہ صاحب میر انیسؔ کی مدح سرائی کرتے ہوئے تین سو سے زیادہ صفحات کی کتاب میں صفحہ دو سو تینتیس پر مرزا دبیرؔ کا ذکر کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:

> ’’تلوار‘‘— مرثیہ گویوں کا سب سے بڑا موضوعِ شاعری یہی ہے۔ اور مرزا دبیرؔ صاحب تو اس عالم میں لامکاں تک پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن عجب بات یہ ہے کہ سب کچھ کہتے ہیں اور غور سے دیکھیے تو (تلوار کے متعلق) کچھ نہیں کہتے۔

اس کے بعد مرزا صاحب کے گیارہ اشعار نقل کر کے لکھتے ہیں:

> ’’خود انصاف کرو، یہ تلوار کی تعریف ہے یا ہوائی طلسم ہے۔‘‘ (ص ۲۳۳)

علامہ صاحب کے اس تبصرے کو پڑھ کر ہم محسوس کرتے ہیں کہ وہ مرزا صاحب کے خلاف پہلے سے بھرے بیٹھے تھے۔ ورنہ موازنے کا تبصرہ اعتدال و انصاف سے کیا جاتا ہے یا دونوں کے کلام کے نص کے کچھ حصے برابر برابر لکھ کر قارئین کے سامنے رکھ دیے جاتے ہیں کہ دونوں کے محاسن و معائب کو خود دیکھ پرکھ لیں، یہاں تو علامہ صاحب نے خود ہی طنزیہ تنقید داغ دی۔ اور خود ہی تنقیص کا پہلو اجاگر کرتے ہوئے فیصلہ صادر کردیا۔

علامہ صاحب نے مرثیے کے اجزاے موضوعات کے حوالے سے عنوانات قائم کیے ہیں مثلاً:

فصاحت

اس موازنے میں میر انیسؔ نے تین اور مرزا دبیرؔ کے تین شعر پیش کیے ہیں اور صرف تین تین شعر مقابلے کے لکھ کر فرما دیا، ’’مرزا دبیرؔ اور میر انیسؔ کے ہم مضمون اشعار کو اگر مرزا صاحب کے یہاں غریب اور ثقیل الفاظ ہوں گے تو ان کے مقابلے میں میر صاحب کے یہاں فصیح الفاظ ہوں گے اور اگر مرزا صاحب کے یہاں فصیح الفاظ ہوں گے تو میر صاحب کے یہاں فصیح تر الفاظ ہوں گے۔‘‘ (ص ۲۱)

فصاحت کے بیان میں میر انیسؔ کی تعریف میں آٹھ صفحے بھر دیے ہیں، ان میں مرزا دبیرؔ کا ذکر صرف ایک دفعہ آیا ہے۔

کلام کی اصلی ترتیب کا قائم رکھنا

بائیس اشعار اس باب میں نقل کیے ہیں، ان میں مقابلے کے لیے مرزا دبیرؔ کا ایک بھی شعر نہیں ہے۔

روزمرہ اور محاورہ

میر انیسؔ کے نو اشعار نقل کیے ہیں، مرزا صاحب کا کوئی شعر نہیں۔ اس مضمون کا مرزا دبیرؔ کا کوئی شعر مقابلے میں درج نہیں کیا۔ میر انیسؔ کے بائیس شعر نقل کیے ہیں۔

بلاغت

اس باب میں علامہ صاحب لکھتے ہیں، ''انیسؔ و دبیرؔ کے موازنے میں یہ فقرہ ضرب المثل ہوگیا ہے کہ میر صاحب میں فصاحت زیادہ ہے اور مرزا صاحب میں بلاغت۔ یہ فقرہ جس قدر مشہور ہے اسی قدر غلط۔'' (ص ۴۶)

اس فن کے بارے میں علامہ صاحب نے تفصیل سے بحث کی ہے اور مقابلے میں مرزا دبیرؔ صاحب کے دس گیارہ اشعار نقل کرکے لکھا ہے، ''یہ تمام قصہ بالکل بلاغت اور مقتضاے حال کے خلاف ہے۔'' ظاہرہ میں یہاں علامہ کا اعتراض صحیح معلوم ہوتا ہے مگر انھیں اپنے قول کی قطعی صحت کے لیے انیسؔ و دبیرؔ کے آٹھ دس بند مقابل رکھنے چاہیے تھے۔ یہاں قاری یہ سمجھتا ہے کہ علامہ نے جان بوجھ کر دبیرؔ کا جو پہلو دبتا تھا، اسے مثال بنا کر ان کی قصداً تنقیص کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اپنی تنقیدی رائے کو نبھانے کے لیے طویل بحث کے بعد واضح کردیا، ''غرض ہر واقعے اور ہر معاملے کے بیان کرنے میں بلاغت کا یہ اقتضا ہے کہ اس کی تمام خصوصیات اس طرح دکھائی جائیں کہ دلوں پر وہی اثر طاری ہو جو خود واقعے کے پیش آنے سے پڑتا ہے۔'' (ایضاً، ص ۵۲)

ہم اس واقعے کے بارے میں عرض کرتے چلیں کہ رثائی ادب میں یہ معاملہ روایت و درایت کا ہے، اس کا تعلق تحقیق سے ہے جبکہ جس واقعے پر بحث کی جا رہی ہے، وہ تحقیق نہیں تخلیق ہے۔ ویسے بھی موازنہ انیسؔ و دبیرؔ تحقیقی نہیں، تخلیقی ادب کا حصہ ہے۔ اس واقعے کو فنی سقم پر کیسے محمول کیا جاسکتا ہے۔ بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے علامہ صاحب لکھتے ہیں:

> مرثیوں میں جو مضامین قدرِ مشترک کے طور پر ہیں، وہ یہ ہیں، آمادگیِ سفر، راہ کی تکلیفات، صعوبتیں، قیام گاہ کا انتظام، دشمنوں کی روک ٹوک، معرکے کی تیاریاں، رزم آرائی، رجز، حریفوں کا قتال و جدال، دشمنوں کی فتح، اہلِ حرم کی بے کسی اور بے چارگی، شام کا سفر، قید خانہ، دربار کی حاضری۔

یہ عنوانات انھوں نے بلاغت کا پہلو نمایاں کرنے کے لیے قائم کیے ہیں۔ ان کے بعد تقریباً سولہ صفحات میں میر انیسؔ کے کلام کی تعریف کی ہے اور تقریباً تیس پینتیس بند اُن کے مراثی سے مثال میں پیش کیے ہیں۔ دریں اثنا مرزا دبیرؔ کا تقابلاً کوئی ذکر نہیں ہے۔ البتہ اس طویل بحث کے بعد مرزا صاحب سے میر صاحب کا موازنہ بھی کرتے ہیں تو یہ کہ جب کربلا میں سب رفقا شہید ہوگئے۔ آپ تنہا بے بسی کے عالم میں کھڑے ہیں کہ ایک راہ گیر آپ سے پوچھتا ہے، آپ کون ہیں۔ میر انیسؔ لکھتے ہیں:

یہ تو نہیں کہا کہ شاہ مشرقین ہوں
مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

وہ مزید لکھتے ہیں، ''اس شعر میں بلاغت کے جو نکتے ہیں، صرف مذاقِ صحیح ان کا احاطہ کرسکتا ہے۔'' اس ضمن میں البتہ اُنھوں نے مرزا دبیرؔ کا براہِ راست موازنہ کیا ہے اور لکھا ہے:

> اس موقعے پر یہ کہے بغیر رہا نہیں جاسکتا کہ اسی واقعے کو مرزا دبیرؔ صاحب نے اس طرح باندھا ہے:
>
> فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں
>
> میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے موازنے کی جو بحث ہے، اس کے فیصلے کے لیے دونوں کے صرف یہ دونوں مصرعے کافی ہیں۔ (ایضاً، ص۶۶)

اب قارئین خود اندازہ کرلیں کہ موازنے کا یہ انداز کتنا دلچسپ ہے کہ ایک طرف تو مثال کے اشعار کا ڈھیر لگا دیا۔ ایک یا دو نہیں پینتیس یا چالیس بند لکھ ڈالے، ہر زاویے سے میر انیسؔ کی فوقیت بیان کردی اور اس کے مقابلے میں مرزا دبیرؔ کو ایک مصرعے میں فارغ کردیا۔ حالاں کہ اس موقعے پر مرزا دبیرؔ کے کلام سے بھی انھیں موضوعات پر ان کے دس پندرہ بند پیش کرکے فرماتے کہ ان میں ثقالت ہے یا فصاحت ہے، تب ہم مانتے کہ یہ کتاب مناقب نہیں، موازنہ ہے۔

بلاغت کے باب میں فارسی ادب سے نظامیؔ اور فردوسیؔ کے کلام سے بھی مثالیں دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں، ''نظامیؔ نے بھی ایک موقعے پر اس اسلوب کو برتا ہے۔'' اور فردوسیؔ کا حوالہ بھی دیا ہے، اس کے بارے میں لکھا ہے، ''فردوسیؔ بلاغت کے تمام اصولوں سے واقف تھا۔'' (ایضاً، ص ۸۷)

دونوں فارسی شعرا کے بارے میں تفصیلی بحث ہے جسے ہم نے جان بوجھ کر نظرانداز کردیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میر انیسؔ نے بعض بندوں میں کلام میں زور پیدا کرنے کے لیے عربی تراکیب استعمال کی ہیں، اس سے کلام میں غرابت پیدا ہوگئی ہے اور کلام پایۂ فصاحت سے گر گیا ہے اور دائرۂ ثقالت میں داخل ہوکر بے طرح ہوگیا ہے مگر علامہ صاحب یہاں کھل کر میر انیسؔ کی حمایت کرتے ہیں اور ثقالتِ کلام کا جواز پیدا کردیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

> اس موقعے پر انیسؔ نے اپنی عادت کے برخلاف متعدد عربی جملے استعمال کیے ہیں جو اردو میں غریب اور نامانوس معلوم ہوتے ہیں لیکن ان جملوں کی وجہ سے اس وقت کی حالت کی جو تصویر کھنچ جاتی ہے، وہ کسی اور طرح ممکن نہیں ہوتا۔ (ایضاً، ص ۸۰)

واضح رہے کہ علامہ صاحب نے انیسؔ کے مراثی میں بلاغت کے باب میں چودہ بند نقل کردیے ہیں مگر اس مضمون کا مرزا دبیرؔ کا کوئی بند نقل کرکے یہ نہیں بتایا کہ مقابلہ کرکے دیکھ لو مرزا کے اسی مضمون کے بیان میں بلاغت کے مقابلے میں کتنی ثقالت ہے۔

اس کے بعد علامہ صاحب استعارات وتشبیہات کے فنی نکات بیان کرتے ہیں۔ ان کی قسمیں بیان کرتے ہیں۔ عام شعرا کے یہاں ان کے استعمال میں ان کے حسن وقبح سامنے لاتے ہیں۔ علامہ صاحب کی صنائع بدائع کے مبحث اس لحاظ سے قابلِ تعریف ہیں کہ یہ عام نکات نہیں ہیں، اس لیے ان کا علم ہر عام کہ ومہ کو آسانی سے نہیں ہوتا اس لیے ہم علامہ کی ایسی کاوش کو قابلِ تحسین سمجھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

علمائے معانی نے لکھا ہے کہ تشبیہ کی غرض کبھی مشبہ کی رفعت اور حسن اور کبھی تحقیر اور ذلت اور کبھی رعب و ہیبت ہوتی ہے۔ یہ باتیں میر انیسؔ کی تشبیہات میں کمال کے درجے پر پائی جاتی ہیں۔
(ایضاً،ص ۸۵)

اس فن میں بھی اس موقعے پر مرزا دبیرؔ کا کوئی ذکر نہیں ہے البتہ ایہام اور مبالغے کے باب میں انھوں نے بعض فارسی اور عربی شعرا کے حوالوں کے بعد لکھا ہے:

میر انیسؔ کے زمانے میں مبالغہ کمال کی حد تک پہنچ چکا تھا اور یہ حالت ہوگئی تھی کہ جب تک مبالغے میں انتہا درجے کا استبعاد نہیں ہوتا تھا، سامعین کو مزہ نہیں آتا تھا۔ مجبوراً میر صاحب نے بھی وہی راہ اختیار کی چوں کہ ان کی اصل فطرت میں سلامت روی اور اعتدال تھا اس لیے وہ اپنے حریف مرزا دبیرؔ سے بہت پیچھے رہ گئے اور یہی بات ہے کہ جس کی بنا پر ان کے حریف کہتے ہیں کہ وہ خیال بندی اور مضمون آفرینی میں مرزا دبیرؔ کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ (ایضاً،ص ۹۴)

ہمارا خیال ہے کہ ’’موازنہ‘‘ لفظ کی لاج رکھتے ہوئے جہاں علامہ نے انیسؔ کے بیسیوں شعر نقل کیے تھے، ان کے مقابلے میں دس بارہ مرزا دبیرؔ کے اشعار بھی نقل کر دیتے تاکہ بحث کے فنی نکتے کی کچھ توتکمیل ہوجاتی۔ انھوں نے آگے چل کر حسنِ تعلیل، صفتِ طباق، مراعات النظیر اور لف ونشر وغیرہ کی مثالیں لکھی ہیں۔ مگر مقابلے میں یہاں مرزا دبیرؔ کا کلام کہیں نظر نہیں آتا۔ اس کے بعد نیا باب شروع کرتے ہیں، ’’انسانی جذبات یا احساسات‘‘ کے عنوان سے۔ اس باب میں علامہ شبلی اس سوال کا جواب بھی فراہم کر دیتے ہیں جو آج بھی محفلِ سخن وراں میں گرداں رہتا ہے، اس لیے ہم وہ یہاں نقل کیے دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

یہ شاعری کی اصل روح رواں ہے اگر مُل صاحب کی رائے تسلیم کرلی جائے تو صرف اسی چیز کا نام شاعری ہے۔ شاعری درحقیقت مصوری ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جذبات اور محسوسات کی تصویر کھینچنا اس قدر دشوار نہیں جس قدر غیر محسوسات اور غیر مادّی اشیا کا نقشہ اتارنا مشکل ہے۔ ایک درخت کی تصویر کھینچنی ہو تو کسی قسم کے تخیل اور دیدہ وری کی ضرورت نہیں۔ ٹہنیاں، پھل، پھول، پتّے سب سامنے ہیں، ہر شخص انھیں محسوس کرسکتا ہے۔ مصور کا بس یہ کمال ہے کہ ہر چیز کا نقشہ کھینچ دے لیکن رنج، غم، جوش، محبت، غیض، بےقراری، بےتابی، مسرت، خوشی، محسوس اور مادّی چیزیں نہیں ہیں۔ آنکھ ان کو محسوس نہیں کرسکتی البتہ دل پر ان کا اثر ہوتا ہے۔ لیکن یہ اثر سب پر یکساں نہیں ہوتا، اس لیے ان کی ہو بہو اصلی تصویر اتارنا مشکل ہے۔ (ایضاً،ص ۱۰۲)

اس باب میں علامہ صاحب نے میر انیسؔ کے دو سو سات بند نقل کیے ہیں اور بتایا ہے کہ جذبات نگاری اور انسانی احساسات کے بیان پر میر صاحب کو یدِ طولیٰ حاصل تھا مگر مرزا دبیرؔ کے بارے میں ان کا قلم قطعی خاموش ہے یعنی مقابلے میں دبیرؔ کا ایک بند بھی نقل کر کے یہ نہیں بتاتے کہ انیسؔ کے مقابلے میں مرزا دبیرؔ کا پہلو کس درجے رہتا ہے حالاں کہ یہ امر موازنے کا متقاضی تھا۔

اس کے بعد عنوان قائم کرتے ہیں ''مناظرِ قدرت''۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس موضوع پر وہ میر انیسؔ سے میر ضمیرؔ کا موازنہ تو کرتے ہیں مگر مرزا دبیرؔ کو جو اس تصنیف کا اصل کردار ہیں، یکسر فراموش کر جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> عربی اور فارسی میں مناظرِ قدرت پر بہت کم لکھا گیا ہے، اردو میں تو گویا سرے سے اس کا وجود ہی نہ تھا۔ میر ضمیرؔ نے سب سے پہلے اس پر طبع آزمائی کی لیکن وہ مضمون بندی اور استعارات کو کلام کا جوہر سمجھتے تھے اس لیے اصلی حالت نہ ادا کر سکے۔ میر انیسؔ نے اس صنف پر اگرچہ صرف دو تین مرثیے لکھے ہیں لیکن جو کچھ لکھا ہے، کمال کے درجے پر پہنچا دیا ہے۔ (ایضاً، ص ۱۴۷۔۱۴۸)

یہاں علامہ صاحب مثال کے سولہ بند نقل کرتے ہیں اور عنوان ہے ''صبح کا منظر'' اس کے بعد ''گرمی کا سماں'' یہاں بھی وہ مرزا دبیرؔ کی کوئی بات نہیں کرتے مگر طالب آملی اور مرزا صائب کے حوالے دیتے نہیں تھکتے مگر مرزا دبیرؔ صاحب کو چنداں خاطر میں نہیں لاتے۔ میر انیسؔ کے چھ بند تعریف کے انداز میں نقل کرتے ہیں۔ اس کے بعد ''منظر یعنی سین'' کا عنوان قائم کر کے لکھتے ہیں، ''کسی خاص واقعے یا کسی خاص حالت کی تصویر کھینچنا جس کو انگریزی میں سین کہتے ہیں۔'' آگے چل کر لکھتے ہیں، ''میر انیسؔ نے شاعری کے اس صنف کو جس کمال تک پہنچایا اردو کیا فارسی میں بھی اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔'' (ایضاً، ص ۱۵۴)

بعد ازاں مثال میں اٹھانوے بند مرثیے کے نقل کیے ہیں۔ یہاں بھی مرزا دبیرؔ کے کلام سے کچھ نقل کرنے سے اجتناب برتا ہے اور ایک بند بھی ان کے مرثیے کا نقل نہیں کیا۔

منظر نگاری کے بعد مضمون قائم کرتے ہیں، ''واقعہ نگاری''۔ شبلی نے واقعہ نگاری کے باب میں بڑی طویل بحث کی ہے۔ فارسی میں مضبوط اور اردو میں کمزور واقعہ نگاری قرار دیا ہے، تاہم انیسؔ کے بارے میں لکھا ہے کہ میر انیسؔ نے واقعہ نگاری کو جس کمال کے درجے تک پہنچایا ہے، اردو کیا فارسی میں بھی اس کی نظیر مشکل سے مل سکتی ہے۔ پھر ان کے کمال کی خصوصیات بیان کی ہیں، تقریباً ایک سو تیس بند مثال میں لکھے ہیں مگر اس مضمون کا مرزا دبیرؔ کا ایک بھی شعر نہیں لکھا۔ اس کتاب میں ہم موازنہ تلاش کرتے رہے مگر ہمیں موازنہ یا موازنے کا ذرا بھی انداز نظر نہیں آیا۔ محاسنِ کلامِ انیسؔ بیان ہوتے چلے گئے ہیں۔ اس عنوان سے گزر کر انیسؔ کی ''رزمیہ'' پر آتے ہیں، رزمیہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے وہ چند فارسی شعرا کا ذکر کرتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ رزمیہ شاعری کی تعریف بیان کرتے ہیں اور اسے فارسی شعرا کا کارنامہ گردانتے ہیں۔ خاص طور سے ''شاہ نامۂ فردوسیؔ'' کے بارے میں خوب رطب اللسان ہوئے ہیں۔ فرماتے ہیں:

> فارسی میں ''شاہ نامہ'' اور ''سکندر نامہ'' کو الگ کر لیا جائے تو کچھ باقی نہیں رہتا لیکن ایک شاہ نامہ ہزاروں کتابوں پر بھاری ہے۔ اس لیے فارسی شاعری کا رتبہ اس حیثیت میں عربی سے بڑھا دیا۔
>
> (ایضاً، ص ۲۱۳)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

> مرثیے میں میر ضمیرؔ نے رزمیہ کی ابتدا کی لیکن وہ بالکل نقشِ اوّلیں تھا۔ میر انیسؔ نے جس طرح اس

صنف کو کمال کے درجے تک پہنچایا اس کے لحاظ سے اردو شاعری گو فارسی کی برابری کا دعویٰ نہیں کرسکتی لیکن عربی سے کسی طرح پیچھے نہیں۔

یہاں تک تو غنیمت تھا مگر علامہ صاحب نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مثال میں ''شاہ نامہ'' سے سترہ اشعار نقل کر دیے اور فرمایا، اس کے مقابلے میں میر انیس کا رزمیہ دیکھو' اور میر انیسؔ کے مرثیے سے تیس بند پیش کر دیے۔ اس طویل تقابلی بحث کو پڑھ کر ہمارا ذہن بھی کچھ لمحے تو اس خیال کی طرف چلا گیا کہ ہم موازنۂ انیسؔ و فردوسیؔ پڑھ رہے ہیں کیوں کہ ''شاہ نامہ'' کے اشعار کے مقابلے میں مزید چند صفحات انیسؔ کی مداحی میں تحریر کر کے فرماتے ہیں، ''فردوسیؔ کا بڑا کمال خیال کیا جاتا ہے کہ وہ لڑائی کے تمام جزئیات، داؤں پیچ اور فنونِ جنگ کا نقشہ کھینچتا ہے لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ سرسری اور معمولی باتوں کے سوا لڑائی کے ہر قسم کے اور کرتب نہیں دکھاتا، سب سے بڑا سین جو اُس نے دکھایا ہے، وہ رستم اور اشکبوس کا معرکہ ہے۔ اس موقعے کے اشعار یہ ہیں۔'' اس کے بعد پانچ اشعار فارسی کے نقل کیے گئے ہیں اور لکھا ہے، ''ان اشعار میں تیر اندازی کا وہی معمولی طریقہ ادا کیا ہے البتہ نہایت شان دار اور پُرزور الفاظ میں ادا کیا ہے۔ لیکن میر انیسؔ لڑائی کے ہر قسم کے کرتب اور ہنر اس تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ عربی اور فارسی میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ ملاحظہ ہو۔ اس کے بعد انھوں نے میر انیسؔ کے مرثیے سے اٹھارہ بند نقل کر کے پھر فارسی شعرا کی مزید موضوعات کے مثلاً ''گھوڑا'' کے بیان میں فردوسیؔ، عبدالواسعؔ، عرفیؔ، زیدیؔ وغیرہ کے حوالوں اور تعریف و توصیف کے بعد انھیں مرزا دبیرؔ یاد آجاتے ہیں اور اس تمام بحث میں وہ ان کا صرف ایک مصرع مثال میں پیش کرتے ہیں اور لکھتے ہیں، ''مرزا دبیرؔ صاحب فرماتے ہیں:

سرعت کا یہ عالم ہے کہ سن بڑھ نہیں سکتا''

اس کے بعد ماقبل تفصیل کے بارے میں تبصرہ فرماتے ہیں:

> ان تمام اشعار کے نقل کرنے سے مقصود یہ ہے کہ فارسی اور اردو میں جو کچھ گھوڑے کی مدح میں لکھا گیا، وہ صرف ناممکنات کے افسانے تھے کسی نے یہ نہیں لکھا کہ گھوڑے کے اصلی خدوخال، ڈیل ڈول، چہرہ مہرہ، چل پھر، آؤ جاؤ کا نقشہ دکھاتا۔

میر انیسؔ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> میر انیسؔ صاحب بھی اگرچہ مذاقِ عام کی پیروی سے اکثر بہکتے ہیں۔ چناں چہ فرماتے ہیں:
>
> آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو

اس کے بعد حسبِ منشا مثال کے طور پر ان کے کلام سے پندرہ بند نقل کر دیتے ہیں۔ البتہ ''تلوار'' کے موضوع پر مرزا دبیرؔ کے فن سے گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> مرثیہ گویوں کا سب سے بڑا موضوع شاعری یہی ہے اور مرزا دبیرؔ صاحب تو اس عالم میں لامکاں تک پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سب کچھ کہتے ہیں اور غور سے دیکھیے تو (تلوار کے متعلق) کچھ نہیں کہتے۔ چناں چہ فرماتے ہیں:

مدِ نگہ چشمِ نیام اوج پر آیا
خط کھینچنے کو کلک دواتِ ظفر آیا
ظلمات میں یہ فتح پہ قبضہ کیے پھری
مثلِ ہوا سروں میں سمائی چلی گئی
ذات اک طرف مٹا دیا اس نے صاف کو
کافِ شگاف بن کے درونِ جگر گئی
لفظ شکم میں دینے کو زیر و زبر گئی
تلواروں پر وہ سیف جو شعلہ فشاں ہوئی
گیا جو فوق سے تحت الثریٰ کو آبِ حسام
فلک نے تختۂ یونان رکھا زمیں کا نام

اور صاف ہر اک فردِ بشر کو نظر آیا
یا دوڑ کے ظلمت کے گلے سے خضر آیا
یونس کو جیسے بطن میں ماہی لیے پھری
بُو کی طرح دماغوں میں آئی چلی گئی
کیسی زباں، زباں میں یہ کاٹ آئی بات کو
مانند میم مرگ میانِ کمر گئی
مانند پیش ہر جز و کل سے گزر گئی
جل بھن کے آب تیغوں کی رن میں دھواں ہوئی
بنا خزانۂ قاروں خرابۂ حمام
ہُوا رطوبتِ اطراف سے زمیں کو زکام

دماغ خاک پہ نزلہ بصد وفور گرا
کیا جو عطیہ تو قاروں نکل کے دور گرا

یہ پوری مثال علامہ صاحب نے حوالے کے طور پر کتاب میں درج کی ہے۔ ہم نے بھی اسے من وعن نقل کر دیا کیوں کہ دوسو تینتیس صفحے موازنے کی گفتگو کرنے کے بعد علامہ صاحب کو پہلی مرتبہ مرزا دبیرؔ کے کمال کے مقابلے کے شعر نمایاں کرنے کا خیال آیا۔ یہ مثال پیش کرنے کے بعد علامہ صاحب فرماتے ہیں، ''خود انصاف کرو، یہ تلوار کی تعریف ہے یا ہوائی طلسم ہے۔'' (ایضاً، ص ۲۳۳)

واقعی یہ طلسم ہے کیوں کہ ان کے دور میں لکھنؤ کا مزاج طلسماتی تھا۔ لکھنؤ کی شاعری کے جمالیات، خیال، حسن و جمال کی ہیولیٰ آرائی سے لطف اندوز ہو کر داد دیتے تھے۔ کلام کی طلسم آرائی ہی اس دور کی انجمن آرائی تھی۔ خود میر انیسؔ کا ابتدائی کلام یہ ظاہر کرتا ہے کہ میر انیسؔ کے سادہ، سلیس اور آسان کلام کو وہ پذیرائی حاصل نہ تھی جو مرزا دبیرؔ کے دقیق کلام کو حاصل تھی۔ میر انیسؔ کا خاندان دہلی سے ہجرت کر کے لکھنؤ میں جا آباد ہو گیا تھا۔ ان کی تیسری پشت تھی مگر انھوں نے زبان کے معاملے میں اپنی وضع داری قائم رکھی تھی اور روزمرہ اور محاورے کے استعمال میں کوئی فرق نہ آنے دیا تھا۔ اگر لکھنؤ کے اہلِ محفل ان کے کلام کی خاطر خواہ داد نہ دیتے اور وہ سمجھتے کہ سامعین بے مزہ ہو رہے ہیں تو برملا فرما دیتے، ''صاحبو! یہ میرے گھر کی زبان ہے، اہلِ لکھنؤ اس طرح نہیں بولتے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اگر ہم انیسؔ اور دبیرؔ کا کلام دیکھیں تو ہمیں یقیناً انیسؔ کا کلام بھائے گا کیوں کہ ہم سرسیّد اور حالیؔ کی آسان اور عام فہم زبان کے تقلیدی ادب کے پروردہ اور مزاج شناس ہیں جبکہ انیسؔ اور دبیرؔ کے زمانے میں لکھنؤ کے لوگوں کا مزاج عاشقانہ تھا۔ وہ رگِ گُل سے بلبل کے پر باندھتے تھے:

فرش مخمل پہ مرے پیر چھلے جاتے ہیں
کیلا کھانے سے مرے دانت ہلے جاتے ہیں

یہ شعر اُسی زمانے کے کسی شاعر کا تھا۔ اسی زمانے کا ایک اور شعر یاد آ رہا ہے:

کسی کی محرم آبِ رواں کی یاد آئی
حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا

اس شعر کی نزاکتِ خیال بے مثال ہے۔ یہ شعر ہے تو عاشقانہ مگر سماجی رچاؤ اور محبوب کے جسم کی نزاکت کا بیان اس دور کے جمالیاتی ذوق کی ترجمانی کرتا ہے۔

انیسؔ و دبیرؔ کے دوسرے دور کا عام رجحان عالمانہ تخیل اور عالمانہ اندازِ گفتگو تھا۔ مرزا دبیرؔ کا کلام عالمانہ تصور اور عالمانہ بیان کا شاہ کار ہے۔ انھوں نے شاعری میں زبان استعمال کی ہے، گو وہ علامہ شبلی کے زمانے کی ثقیل زبان تھی مگر دبیرؔ کے زمانے کی لکھنؤ کی عام زبان تھی اور وہاں کے مزاجِ عام کی نمائندگی کرتی تھی یہی وجہ تھی کہ اس دور میں مرزا دبیر کو میر انیسؔ پر ہر طرح فوقیت حاصل تھی۔

مرزا دبیرؔ کے کلام کا اگر بہ نظرِ غائر مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ان کے یہاں نادر تشبیہات، بعید از فہم استعارات، مغشوش مگر دل آویز تراکیب، مشکل پسندی، بلند خیالی اور عالمانہ سخن طرازی۔ یہ ہیں خصوصیات مرزا دبیرؔ کے کلام کی جو اہلِ لکھنؤ کے کلام میں بھی متداول تھیں اور مرغوب تھیں۔ آپ مرزا دبیرؔ کا کلام پڑھتے چلے جایئے، آپ کو سخن طرازی کا طلسم خانہ ہی ملے گا مگر لکھنؤ کے عوام کا معیار ذوق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عظمتِ کلام اور پُر پیچ بیان نے اسے زیادہ مقبول بنائے رکھا۔ دبیرؔ کی غیر معمولی بلند خیالی، طنطنہ، طمطراق نے لکھنؤ کی علمی فضا کو خوب نکھارا اور سخن طرازی کا گہرا رنگ رچایا۔ فحوائے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے لوگ ان کے مقابلے میں مرزا دبیرؔ کے کلام کو اہمیت دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنی بعض رباعیوں میں اس کی شکایت بھی کی ہے۔ خود علامہ شبلی نے اس بارے میں ایک جملہ بڑا معنی خیز لکھا ہے جسے پڑھ کر ہم سمجھتے ہیں کہ مرزا دبیرؔ کے مقابلے میں میر انیسؔ کا کہیں نہ کہیں پہلو ضرور دبتا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> میر انیسؔ صاحب بھی اگرچہ سامعین کی بدمذاقی کے اثر سے کہیں کہیں بے راہ نکل جاتے ہیں تاہم واقعیت اور اصلیت کا جوہر ہر جگہ نمایاں رہتا ہے۔ (ایضاً، ص ۲۳۴)

یہاں تلوار کی تعریف میں میر انیسؔ کے بیس بند مثال کے طور پر نقل کر دیتے ہیں اور انیسؔ و دبیرؔ کے کلام کا موازنہ جس انداز سے کرتے ہیں وہ کچھ حقیقت پسندانہ نظر آتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> اس موقعے پر شاید تمھارے ذہن میں یہ خیال آئے کہ میر انیسؔ کی رزمیہ میں گو الفاظ کی شکوہ اور مثال کی کچھ انتہا نہیں لیکن اصلیت اور واقعیت سے یہ مراحل دور ہیں۔ کربلا کا واقعہ نتائج کے اعتبار سے بے شبہ ایک اہم واقعہ ہے لیکن معرکہ آرائی کے لحاظ سے اس کی صرف یہ حیثیت ہے کہ ایک طرف سو سوا سو آدمی تشنہ لب اور بے سر و سامان تھے، دوسری طرف چار ہزار کا مجمع تھا جو دفعتاً ٹوٹ پڑا اور تین گھنٹے میں لڑائی کا فیصلہ ہوگیا۔ ایسے واقعے کے متعلق یہ کہنا زمیں تھرا گئی، آسماں کانپنے لگے، پہاڑ جگہ سے ہٹ گئے، دریا اُبل پڑے، فرشتے آسمانوں میں چھپتے پھرتے تھے وغیرہ وغیرہ، واقعیت سے کس قدر دور ہے۔ (ایضاً، ص ۲۳۸)

اس ارشاد کے بعد شاعری کی حیثیت اور اصلی کیفیت کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے وہ فارسی کے شاعر فردوسیؔ اور عربی

شاعر علامہ ثعلبی اور متنبی کا حوالہ دے کر بتاتے ہیں کہ ان کا رزمیہ ہیئت کے قریب ہے۔ اگر حقیقت اور واقعیت کے قریب نہ ہوتا تو ان شعرا کا کلام پایۂ اعتبار سے گر جاتا۔ لکھتے ہیں:

فرض کرو کہ شاہ نامہ کے تمام واقعات غلط ثابت ہوجائیں تو اس سے فردوسیؔ کے کمالِ شاعری میں فرق آئے گا۔

مزید لکھتے ہیں:

وہی واقعات بیان کرنے چاہییں جن سے طبیعت پر واقعی اثر ہو، صرف موہوم خیال بندی اور لفاظی نہ ہو جیسا مرزا دبیرؔ صاحب کا انداز ہے۔ (ایضاً، ص ۲۳۸۔۲۳۹)

یہاں ایک بات اور بھی ہمارے سامنے آئی کہ علامہ صاحب نے پہلی بار انیسؔ کے کلام پر تنقید فرمائی ورنہ ڈھائی سو صفحات میں وہ ان کے محاسن گناتے نہیں تھکتے۔ فرماتے ہیں:

''یہ بات بھی بظاہر کھٹکتی ہے کہ رزم کے بیان میں عشقیہ الفاظ استعمال کرنا، مثلاً:

کس تکلف سے وہ لیلائے ظفر راہ چلی　　گاہ بڑھی، گاہ رُکی، گاہ تھمی، گاہ چلی
کاٹھی سے اس طرح ہوئی وہ شعلہ رُو جدا　　جیسے کنارِ شوق سے ہو خوبرو جدا
سج اس کو ہے پسند جہاں گو نجی نہ ہو　　معشوق پھر نہیں کہ جو اتنی کجی نہ ہو''

اس اعتراض کے بعد فوراً ہی فرمادیا:

''لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اعتراض کی بات نہیں بلکہ میر انیسؔ کے محاسنِ شاعری میں داخل ہے۔''

چلیے رات گئی بات گئی۔ اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اپنے فرمان کی دلیل میں مزید فرماتے ہیں:

علامہ ثعلبی نے ''تمیۃ الدھر'' میں جہاں متنبی کے محاسن گنائے ہیں، یہ بھی ہے کہ وہ لڑائی کے بیان میں غزل کے الفاظ استعمال کرتا ہے اور یہ بھی اس کی ان خصوصیات میں ہے جن کی پہلے کوئی نظیر نہیں ملتی۔ جن میں وہ منفرد ہے۔ (ایضاً، ص ۲۳۹)

بعد ازاں مرزا دبیرؔ اور میر انیسؔ کا موازنہ فرماتے ہوئے رقم طراز ہوتے ہیں:

''دبیرؔ صاحب نے بھی میر انیسؔ کی تقلید کرنی چاہی لیکن کلام کا یہ رنگ ہوگیا:

جب خوں میں بھری فوج کے انبوہ سے نکلی
غل یہ تھا کہ وہ لال پری کوہ سے نکلی

علامہ شبلی رزمیہ کے بعد ''سلام'' کے موضوع پر موازنے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ''سلام'' آج بھی لکھا جارہا ہے مگر علامہ نے جو اس کے فنی ہیئت پر نظر ڈالی ہے اور فنی تعریف بیان کی ہے، وہ آج کے شعرا کے لیے بھی قابلِ تقلید ہے۔ اس لیے ہم علامہ کی رائے من و عن نقل کیے دیتے ہیں۔ علامہ 'سلام' کے بارے میں فرماتے ہیں:

اردو شاعری کی اصل بنیاد غزل پر قائم ہوئی اور اقسامِ سخن میں سے اسی کو سب سے زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ عام مرثیہ گویوں نے اپنے مضمون کی نوعیت کے لحاظ سے مسدس کا طریقہ اختیار کیا مگر غزل کی لے اس قدر کانوں میں رچ چکی تھی، ان لوگوں کو بھی اس انداز میں کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا تھا۔ اس بنا پر انھوں نے غزل کے انداز پر سلام ایجاد کیا۔ سلام کی بحریں وہی غزل کی ہوتی ہیں۔ غزل کی طرح مضمون کے لحاظ سے ہر شعر الگ الگ ہوتا ہے۔ سلام کی خوبی یہ ہے کہ طرح شگفتہ اور فنی بندش تازہ اور صاف مضمون دردانگیز اور پُر تاثیر ہو۔ میر انیسؔ کے کلام میں یہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں۔ (ایضاً، ص ۱۴۰)

یہاں مثال کے طور پر میر انیسؔ کے پانچ سلاموں سے اٹھائیس اشعار نقل کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد رباعی کا بیان ہے۔ رباعی کے بیان میں کہتے ہیں:

میر انیسؔ کی رباعیوں کا ایک بڑا دفتر ہے۔ ہر رباعی میں کوئی نہ کوئی اخلاقی مضمون ادا کیا ہے۔ بعض ایسی بھی ہیں جن میں صرف مضمون بندی یا کوئی صفت ہے۔

مثال میں پندرہ رباعیاں نقل کی ہیں۔ ہم ان میں سے سب سے مشہور رباعی نقل کرتے ہیں:

رتبہ جسے دیتا ہے، خدا دیتا ہے　　وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز، ثنا آپ اپنی　　جو ظرف کہ خالی ہے، صدا دیتا ہے

آخر میں ''اعتراضات'' کا عنوان قائم کیا ہے اور آخر وہ بات بھی علامہ صاحب کے نوکِ قلم تک آ ہی گئی جو کانٹا بن کر ہمارے دل میں کھٹک رہی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

بہرحال ہماری رائے کہ جس وسعت اور تفصیل کے ساتھ میر انیسؔ کی خوبیاں ظاہر کی گئی ہیں، اسی طرح آزادی اور بے باکی کے ساتھ ان کی ہر قسم کی فروگزاشتیں اور غلطیاں بھی ظاہر کی جائیں۔

(ایضاً، ص ۲۴۵)

اس کے بعد میر انیسؔ پر ہونے والے اعتراضات پیش کیے گئے ہیں مگر یہ تمام اعتراضات فنی نوعیت کے ہیں۔ مثلاً ہم یہاں میر انیسؔ پر کیا جانے والا اعتراض اور علامہ کی طرف سے اس کا جواب نقل کرتے ہیں تاکہ یہاں بھی میر انیسؔ کی جانب ان کی رغبت کا پہلو نمایاں ہو جائے۔ علامہ لکھتے ہیں:

ایک زمانہ ہوا عبدالغفور خاں نساخؔ نے میر انیسؔ کی بہت سی غلطیاں ایک رسالے میں ظاہر کی تھیں۔ چناں چہ شروعِ کتاب میں اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ پہلے ہم ان اعتراضات کو اجمالاً مع جواب کے نقل کرتے ہیں۔

۱۔ میر صاحب نے جا بجا سینہ، مدینہ، کینہ، قرینہ کو دانا اور بینا کا قافیہ باندھا ہے۔

حق نما ہے تو جہاں میں ہے یہی آئینہ
اس کا عاشق ہو تو ہوں کور کی آنکھیں بینا

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ قدما کا طریقہ تھا اور میر انیسؔ کا ابتدائی کلام قدما کے استعمال کے موافق ہے۔

۲۔جن الفاظ میں نون کا اعلان ضرور ہے میرؔ صاحب اکثر جگہ اعلان نہیں کرتے، مثلاً:

عباس سے یہ کہنے لگے شاہِ دو جہاں
تم جا کے اُس عرب کو بلا لاؤ بھائی جاں

اس اعتراض کا بھی یہی جواب ہے۔

اس کے علاوہ میر انیسؔ کے کلام پر اعتراضات کی طویل فہرست ہے جو سب کے سب اعتراض نئی نوعیت کے ہیں جو معتبر اساتذہ کی طرف سے وارد کیے گئے ہیں مگر علامہ ان میں سے اکثر کو تسلیم کرتے ہوئے ان کا دفاع کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ بھی قابلِ غور ہے۔ لکھتے ہیں:

> حقیقت یہ ہے کہ میر انیسؔ کے کلام میں اس قسم کی غلطیاں ضرور موجود ہیں مگر یہ عجیب بات ہے کہ جس قدر قادرالکلام اور پُرگو شعرا گزرے ہیں، سب کی یہی حالت ہے۔ فردوسیؔ سے بڑا کون قادر الکلام ہوگا۔ متاخرین میں قاآنی کا جواب نہیں۔ ان دونوں کے کلام میں اس قسم کی بے اعتدالیاں نہایت کثرت سے موجود ہیں۔ لوگ ان شعرا کو نمونہ بناتے ہیں جن کی شاعری کا دعویٰ چند عشقیہ خیالات تک محدود ہے۔ لیکن جو شخص سیکڑوں قسم کے مختلف واقعات کو شعر میں ادا کرنا چاہتا ہے، وہ ان مسامحات سے کیوں کر بچ سکتا ہے۔ اس لیے قادرالکلام شعرا کو اس سے بری رکھنا چاہیے۔

کتاب کے دو سو پچیس صفحات پر مبنی انیس کی تعریف و توصیف کے بعد علامہ صاحب نے ان کی خامیوں کو گنانا شروع کیا ہے۔ یہ خامیاں چوں کہ فنی نوعیت کی ہیں، ہماری نظر میں یہ موازنے کی تعریف میں نہیں آتیں بلکہ ''تنفیر'' کے زمرے میں انھیں لیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ انھوں نے خود لکھا ہے، ''لفظی غلطیوں کے سوا معنوی سے بھی بہت سی باتیں قابلِ اعتراض ہیں۔'' (ایضاً، ص ۲۴۹)

میر انیسؔ آٹھ دس فنی سامحات نقل کر کے لکھتے ہیں:

> ان تمام اعتراضات کا صرف یہ جواب ہے کہ لفظی رعایت کی پابندی کے سوا جو لکھنؤ کی خمیر بن گیا تھا، باقی عیوب لازمۂ انسانی ہیں اور کسی بشر کا کلام اُن سے پاک نہیں ہوسکتا۔ (ص ۲۵۲)

اس کتاب کی ایک پُرلطف بات یہ بھی ہے کہ ڈھائی سو صفحات کالے کرنے کے بعد نئے باب کا آغاز کرتے ہیں اور اس کا 'سرنامہ' لکھتے ہیں اور ''میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کا موازنہ'' فرماتے ہیں:

> اردو علم و ادب کی جو تاریخ لکھی جائے گی اس کا سب سے عجیب تر واقعہ یہ ہوگا کہ مرزا دبیر کو ملک

نے انیسؔ کا مقابل بنایا اور اس کا فیصلہ نہ ہو سکا کہ ان دونوں حریفوں میں ترجیح کا تاج کس کے سر پر رکھا جائے۔ (ص ۲۵۵)

اس رائے کے بعد علامہ نے شاعری کی تعریف بیان کی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ عام قارئین کی دلچسپی کے لیے اسے یہاں نقل کر دیں۔ علامہ رقم طراز ہیں:

> شاعری کس چیز کا نام ہے؟ کس چیز کا، کسی واقعے کا، کسی حالت کا، کسی کیفیت کا، اس طرح بیان کیا جائے کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ دریا کی روانی، جنگل کی ویرانی، باغ کی شادابی، سبزے کی مہک، پھولوں کی مہک، خوشبو کی لپٹ، نسیم کے جھونکے، دھوپ کی سختی، گرمی تپش، جاڑوں کی ٹھنڈ، صبح کی شگفتگی، شام کی دل آویزی یا رنج وغم، غیض وغضب، جوش ومحبت، افسوس اور حسرت، عیش وطرب، استعجاب وحیرت ان چیزوں کا اس طرح بیان کرنا کہ وہی کیفیت دلوں پر چھا جائے۔ اسی کا نام شاعری ہے۔ (ص ۲۵۶)

شاعری کی تعریف بیان کرنے کے بعد علامہ صاحب مرزا دبیر کی شاعری پر تبصرہ فرماتے ہیں اور لکھتے ہیں:

> اس کے ساتھ الفاظ میں فصاحت، سلاست، روانی، بندش میں چستی اور چستی کے ساتھ بے تکلفی، دل آویزی اور برجستگی، لطیف اور نازک تشبیہات اور استعارات، اصولِ بلاغت کے مراعات ان تمام اوصاف میں سے کون سی چیز مرزا دبیرؔ میں پائی جاتی ہے۔

علامہ صاحب اسی پر بس نہیں کرتے۔ ان کا نوکِ قلم کسی طور مرزا دبیرؔ کو بخشنے کو تیار نہیں۔ لکھتے ہیں:

> فصاحت ان کے کلام کو چھو کر بھی نہیں گئی، بندش میں تعقید اور اخلاقی تشبیہات اور استعارات اکثر دور از کار۔ بلاغت نام کو نہیں۔ کسی چیز یا کسی کیفیت یا حالت کی تصویر کھینچنے سے وہ بالکل عاجز ہیں۔ خیال آفرینی اور مضمون بندی البتہ ہے لیکن اکثر جگہ اس کو سنبھال نہیں سکتے۔

اس کے باوجود علامہ صاحب کو اس امر کا اعتراف کرنا پڑا:

> ہماری یہ غرض نہیں ہے کہ ان کے کلام میں سرے سے یہ باتیں پائی ہی نہیں جاتیں۔ وہ نہایت پُرگو تھے۔ ان کے اشعار کا شمار ہزاروں کیا، لاکھوں تک ہے۔ اخیر میں وہ میر انیسؔ کی تقلید بھی کرنے لگے تھے، اس بنا پر ان کے کلام میں جا بجا شاعری کے لوازم اور خاصے پائے جاتے ہیں۔ (ص ۲۵۶)

موازنے کا یہ کیسا انداز ہے، ہماری سمجھ میں نہیں آیا، ''کبھی ہاں! کبھی ناں۔'' خود علامہ صاحب تردّد کا شکار نظر آتے ہیں۔ کیا کہیں، کیا نہ کہیں۔ کیا کریں۔ اس کے بعد کتاب کے اگلے پچاس صفحات میں علامہ صاحب نے شاعری کے فنی نکات کو سامنے رکھ کر دونوں مشاہیر کا براہِ راست موازنہ کیا ہے۔ وہ مرزا دبیرؔ کے کلام کی ثقالت اور تعقید پر تو اعتراض اٹھاتے رہے مگر دبیر کی بلند خیالی اور پُرزور عالمانہ اندازِ بیاں جسے ''طنطنہ'' کہا جاتا ہے اور پہلوانی میں ''رستم سا'' مانا جاتا ہے، یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بعد ازاں ہمارے

یہاں ایک مثال غالب کی ہے۔ ان کے زمانے میں ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا مگر انھوں نے خود یہ کہہ کر:

کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

خود اپنے آپ کو منفرد قرار دے کر مقابلے سے الگ کر لیا تھا۔ ورنہ اس دور میں حالیؔ، مومنؔ، ذوقؔ اور غالبؔ سب یکتائے عہد تھے۔ مگر ان چاروں کا اسلوب مانند ہم دگر نہ تھا۔ اس سے ان چاروں شعرا کے شعری مرتبے میں فرق نہیں آیا۔ اسی طرح انیس کو دبیرؔ کے فنی نکات کا اتنا نہیں، اسلوبِ بیاں اور طرزِ نگارش کا معاملہ ہے۔ میر انیسؔ مثنوی ''سحر البیان'' کے وارث ہیں، انھوں نے اپنی سہل پسندی کی طرف جب لکھنؤ والوں کا جھکاؤ نہ دیکھا تو خود اعلان کیا، ''صاحبو! یہ میرے گھر کی زبان ہے، اہلِ لکھنؤ اس طرح نہیں بولتے۔'' ہم نے میر انیسؔ کی رباعیات کا اپنے طالب علمی کے زمانے میں مطالعہ کیا تھا۔ اب وہ رباعی ذہن سے محو ہو چکی ہے جس میں میر انیسؔ بڑی دل سوزی سے اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ لوگ میرے کلام کی کھل کر اس طرح داد نہیں دیتے جس طرح دینی چاہیے۔ انھوں نے سہل پسندی اور سادہ روی اختیار کی، یہ ان کی خاندانی روایت رہی تھی جبکہ لکھنؤ والوں کا مزاج عالمانہ اور ثقیل کلام اور پُر پیچ خیالات کی لطافت سے احتزاز حاصل کرنے کا عادی تھا۔

اس بحث کے بعد ہم یہ سمجھتے ہیں کہ علامہ شبلی صاحب نے اس نظریے کے موازنہ انیسؔ و دبیرؔ کیا ہے کہ مجھے کیا پسند ہے اور کیا پسند نہیں ہے۔



العالم الاسلامی

بابائے ڈاکٹر مولوی عبدالحق

ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب

پیش لفظ: السیّد عابد رضوی

قیمت: ۸۵۰ روپے

انجمن ترقیِ اردو پاکستان، ایس ٹی ۱۰، بلاک ۱، گلستانِ جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی

ڈاکٹر عزیز احسن ❁

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C, Latifabad, Hyderabad.

سندھ میں تقدیسی شاعری

تقدیسی شاعری میں حمد، نعت، منقبت اور مرثیے کی اصناف آتی ہیں۔سندھ باب الاسلام ہے، یہاں دینِ اسلام کا سورج دوسرے خطوں سے قبل طلوع ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سندھی زبان میں قرآنِ کریم کا ترجمہ بھی دوسری زبانوں کے مقابلے میں اوّل وقت میں ہوگیا تھا۔سندھ میں اولیاے کرام نے عشقِ الٰہی کے نغمے الاپے ہیں۔تصوف یہاں کی شعری زمینوں میں شجرِ بارآور ہوا۔اس لیے یہاں رائج ہر زبان میں توحیدی مضامین جلوہ آرا نظر آتے ہیں۔شاہ لطیف رحمۃ اللہ علیہ کے حمدیہ اشعار کا ترجمہ شیخ ایاز نے اس طرح کیا ہے:

تیری ہی ذات اول و آخر		تو ہی قائم ہے اور تو ہی قدیم
تجھ سے وابستہ ہر تمنا ہے		تیرا ہی آسرا ہے ربِ کریم
کم ہے جتنی کریں تری توصیف		تو ہی اعلیٰ ہے اور تو ہی علیم
والیِ شش جہات واحد ذات		رازقِ کائنات ربِ رحیم
(ریختہ)

سید نعمان الحق نے حسین بن منصور حلاج کی کتاب الطواسین کا ترجمہ کیا ہے،اس میں توحید کا خاص بیان ہے، حلاج کہتے ہیں:

حق ایک ہے، اُسے ایک کہا گیا ہے ...... اُس جیسا کوئی نہیں
پس اگر میں یوں کہوں کہ ...... جس کو ایک کہا گیا، ایک مانا گیا
اُس کی یکتائی ...... اُس سے ہے کہ جس نے ایک کہا، ایک مانا
تو میں نے ...... کہنے اور ماننے والے کا رشتہ جوڑا
یکتائی، اکائی، اور ...... یگانگی!

(رنگ برنگ طیلساں، کتاب الطواسین، ابن منصور حلاج، ترجمہ: سید نعمان الحق، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۲۴ء، ص ۱۲۲)

انسان کی نظر خوگرِ پیکرِ محسوس ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے تصور سے تجریدی افکار کی روشنی میں شاعری کرنا مشکل ہوتا

❁ ناظم، نعت ریسرچ سینٹر، کراچی۔فون: ۰۳۱۸۔۸۰۹۳۴۵۶

ہے۔ اس لیے عام شعرا نے حمدیہ شاعری کی طرف بہت کم توجہ کی ہے۔ تاہم سندھ میں اردو حمدیہ شاعری کے نقوش بھی گہرے ہیں۔ حضرت حسّانؓ حمد و نعت بک بینک پاکستان کے بانی غوث میاں نے جولائی ۱۹۹۸ء میں ''انتخابِ حمد'' شائع کیا تھا جس میں سندھ کے شعرا کا تخلیقی حصہ نمایاں ہے۔ جہانِ حمد اور ارمغانِ حمد کے نام سے طاہر سلطانی نے مجلّے جاری کیے اور ان کے مشتملات کو کتابی صورت میں شائع بھی کیا۔ ان کتب میں بھی پیشتر اُن شعرا کی حمدیں ہیں جن کا تعلق سندھ سے ہے۔ حال ہی میں شاعر علی شاعر نے ''ہزار حمد'' کے نام سے ایک ہزار حمدیہ تخلیقات مرتب کی ہیں جن میں تقریباً ۲۰ فیصد حصہ سندھ کے شعرا کا ہے۔ خود شاعر علی شاعر نے ''حمد کے سات رنگ'' کے نام سے، سات ہیئتی شعری اصناف میں حمدیہ اشعار کہہ کر انھیں کتابی شکل دی ہے۔

نور احمد میرٹھی نے ۲۱۱ غیر مسلم شعرا کی حمدیہ شاعری کو ''گل بانگِ وحدت'' کے نام سے کتابی شکل دی۔

حال ہی میں مجھے سندھی کے معروف شاعر و ادیب نصیر سومرو کے حمدیہ و نعتیہ کلام کا مسودہ دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ ان کی ایک حمد کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

یہ جو بادل برس رہا ہے
یہ دریا جو بہہ رہا ہے
یہ ہوا جو سرسراتی ہے
یہ چرند، یہ پرند، یہ کہکشاں کی گردش
یہ سب تیرے اشارے پر ہیں
یہ سب تیرے ذکر میں مگن ہیں

تو جو چاہے تو صحرا میں نخل کھلیں
تو جو چاہے تو چٹانوں سے چشمے پھوٹیں
تو جو چاہے تو راتیں اجالوں میں ڈھل جائیں
تو جو چاہے تو ایک لمحہ صدیوں میں بدل جائے
تیرے کرم کے سائے میں بزم روشن ہے
ہر راہ پر تیری رحمت کے چراغ جلتے ہیں
ہر ساز کی لے میں تیرا ہی نغمہ گونجتا ہے
ہر دل کی دھڑکن میں تیرا ہی نام بستا ہے
اے نورِ مطلق، اے محورِ ہست و بود!
یہ زمین یہ آسمان، یہ وقت کی گردش

یہ سب تیرے حکم پر رواں دواں ہیں (غیر مطبوعہ کلام، حمدیہ و نعتیہ شاعری، نصیر سومرو)
آج کل نعتیہ مجموعوں کے ساتھ ساتھ حمدیہ شاعری کے مجموعے بھی منظرِ عام پر آنے لگے ہیں۔
اسلام سے وابستگی کی شرطِ اول حبِّ رسول ﷺ ہے اس لیے سندھ میں نعتیہ شاعری بھی ابتدا ہی سے ہونے لگی تھی۔
جامعاتی سطح پر اردو نعتیہ شاعری کا تحقیقی تعارف بھی سب سے پہلے سندھ میں کروایا گیا تھا۔رمضان المبارک ۱۳۹۸ ہجری مطابق ۱۹۷۸ عیسوی میں شعبۂ اردو سندھ یونی ورسٹی کی جانب سے مجلہ ''صریرِ خامہ'' کا نعت نمبر شائع کیا گیا جس کے نگران شیخ ایاز تھے اور اس کی ترتیب کا سہرا حمایت علی شاعرؔ کے سر رہا۔
جامعہ سندھ میں پہلی بار ہفتۂ سیرت منایا گیا تھا اس لیے مذکورہ مجلّے کی ابتدا شیخ ایاز کے خطبۂ صدارت سے ہوئی۔
اس خطبے میں انھوں نے اس بات پر بھی مسرت کا اظہار کیا تھا کہ جامعہ سندھ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہوا کہ اس میں ''رب العالمین کے آخری عظیم المرتبت پیغمبر رحمۃ للعالمین کی سیرتِ پاک کے مطالعے کے لیے سیرت چیئر [شعبۂ سیرت] کا قیام عمل میں لایا گیا''۔
شیخ ایاز کے خطبۂ صدارت کے بعد شاہ لطیف رحمۃ اللہ علیہ کی ایک نعت کا اردو ترجمہ بھی شیخ ایاز ہی نے پیش کیا تھا۔اس نعت کے چند بیت، پیشِ خدمت ہیں:

اگر اللہ پر رکھتے ہو ایماں — رسول اللہ سے بھی لو لگاؤ
سمائے جس میں ان دونوں کا سودا — کسی در پر نہ اس سر کو جھکاؤ
جنھوں نے دل سے اس یکتا کو مانا — محمد ﷺ کو بصد اخلاص جانا
نہ ان کو کوئی گمراہی کا خطرہ — نہ اُن سے دور ہے اُن کا ٹھکانا

اس مجلّے میں ''صحابہ کرام کی نعت گوئی'' پر ایک اہم مضمون کے ساتھ ''اردو نعتیہ شاعری کے سات سو سال'' کے عنوان سے حمایت علی شاعر کا تحقیقی مقالہ ہے جس میں شعرا کے کلام کا نمونہ اور ان کے سوانحی کوائف درج ہیں۔
سندھ کے شہری علاقوں میں شعرا کی اکثریت ہے اس لیے حیدرآباد اور کراچی کے بیشتر شعرا کا اردو نعتیہ کلام کمیت (Quantity) اور کیفیت (Quality) کے اعتبار سے لائق توجہ ہے۔
سندھی زبان میں بے شمار شعرا کا کلام موجود ہے لیکن ہمیں اپنی کوتاہی کا احساس ہے کہ ہم اصل زبان میں اس کلام کے نمونے پیش کرنے سے قاصر ہیں۔البتہ صبیح رحمانی کی کتاب ''پاکستانی زبانوں میں نعت، روایت و ارتقا'' میں شامل کچھ مضامین سے استفادہ کرتے ہوئے اردو نثری ترجمے پیش کر سکتے ہیں۔
ڈاکٹر نواز علی شوق نے ''سندھی نعتیہ شاعری کا مختصر جائزہ'' پیش کرتے ہوئے چند شعرا کے اشعار کا نثری ترجمہ پیش کیا ہے۔شاہ لطیف رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

قیامت کے دن شافعِ محشر ہم گناہگاروں کو نہیں بھولیں گے۔اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو کر اُمت کی شفاعت کی سفارش فرمائیں گے۔وہاں مومنوں کو آنحضور ﷺ کی زیارت نصیب ہوگی۔(ص ۷۵)

عبدالرؤف بھٹی (التوفی ۱۱۲۶ھ) کے ایک شعر کا ترجمہ کیا ہے:

''جدہ سے مکہ مکرمہ پہنچوں، کعبے کا طواف کروں اور آبِ زمزم نوش کروں۔'' (ص ۷۶)

رمضان کمبھار (التوفی ۹۸......۱۸۹۹ء) کے مولودنامے کے اشعار کا ترجمہ:

حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے کفر کی ظلمت ختم ہوئی اور اسلام کا نور پھیلا، مومن خوش اور آباد ہوئے اور کافروں کو مایوسی اور بربادی نصیب ہوئی۔ (ص ۷۷)

سید غلام محمد شاہ گدا (التوفی ۱۹۰۵ء) کہتے ہیں:

محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے پیارے نبی ہیں اور اُن کا نور حضرت آدم علیہ السلام سے بھی پہلے تھا اور اسی نور سے یہ جگ روشن ہوا۔ (ص ۷۸)

ڈاکٹر نواز علی شوق نے بتایا ہے کہ سندھ میں صوفیہ کرام نے تبلیغ کے زیرِ اثر ہندو شعرا نے بھی نعتیں کہیں۔ رانا بھگوان داس کے نعت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یارسولِ خدا سلامٌ علیک   شانِ ربّ العلیٰ سلامٌ علیک
خاتم المرسلیں، سید الاصفیا   شافعِ دوسرا سلامٌ علیک

(ص ۸۵)

ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی کا بھی ایک مضمون بعنوان ''سندھی زبان میں نعتیہ شاعری'' زینتِ کتاب ہے۔ اس میں بھی انھوں نے چند شعرا کے کلام کا اردو ترجمہ پیش کیا ہے۔ ۱۵۲۲ء میں وفات پانے والے شاعر ''قاضی قاضن'' کی ابیات کا ترجمہ پیشِ خدمت ہے:

محشر کے روز جب بے شمار سورجوں کی تپش ہوگی وہ تمام سورج بادل کی طرح محسوس ہوں گے جب وہاں محبوب کا مشاہدہ ہوگا۔ (ص ۸۸)

مخدوم پیر محمد لکھوی (لکھی ضلع شکارپور) التوفی ۱۵۹۰...... یا ۱۶۰۰ء، کی نظم کا ترجمہ ہے:

اے صبا! اے نسیمِ صبح
تو محبوب کا قاصد ہے، اور اُن کا پیغام لانے والا ہے
تو محبوب کے پاس آنے جانے والا ہے
تو محبت کرنے والوں کا رفیق اور عشاق کا محرمِ راز
تو محبوب کی جانب سے اچھی خبریں لانے والا ہے
فراق کے دردمندوں کا پیغام لے جا
دردوفراق والوں کی دوا تمھارے پاس ہے

مدعا کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضۂ اقدس کے سامنے عجز کے ساتھ حاضر ہو
[اور عرض کر] کہ پیرو، ہارون کا بیٹا اور الیاس کا پوتا
جو سندھی ہے، سندھ کا باشندہ ہے اور رقیق القلب عاشق ہے
جسے قسمت نے لکھی میں قید کر رکھا ہے (ص ۸۹)

ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی نے اپنے مضمون میں متعدد شعراے سندھ کی حمدیہ و نعتیہ شاعری کی نشاندہی کی ہے۔ آخیر میں انھوں نے صاحبِ تصنیف شعرا کے تذکرے میں غلام احمد نظامی، محمد بخش واصف، احمد خان آصف، حافظ احسن چند، سید سردار علی شاہ ذاکر، مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ، حاجی احمد ملاح، غالب سندھی، فیض بخشاپوری، عبداللہ اثر، ڈاکٹر محمد ابراہیم خلیل، حاجی علی بخش جمالی، رحیم بخش قمر اور سید گل محمد شاہ گُل کی تصانیف کا ذکر کیا ہے۔

صبیح رحمانی کی مذکورہ کتاب میں پروفیسر آفاق صدیقی کا مضمون بھی شامل ہے جس کا عنوان ہے ''سندھی مولود''۔ شاعرِ ہفت زبان حضرت سچل سرمست کے چند اشعار کا نثری ترجمہ بھی انھوں نے پیش کیا ہے:

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضہء اقدس پر سلام پیش کر۔ ان کا وعدہ ہے کہ وہ بیکسوں کی مدد فرمائیں گے۔ مدینے کے میر ہمیشہ سے بے سہاروں کا سہارا ہیں، وہ حشر میں ہماری شفاعت کریں گے۔ (ص ۱۱۸)

پروفیسر آفاق صدیقی نے متعدد مولود نویس شعراے کرام کا ذکر کیا ہے۔

حافظ حبیب الرحمٰن سیال بخشی نے ''سندھی نعتیہ شاعری پر ایک نظر'' کے عنوان سے مقالہ لکھا ہے، جس میں نعت کی تعریف اور شاعری کے فنی لوازم پر روشنی ڈالی ہے۔ سندھی مولود پر مرتب کردہ کتب کا اجمالی تعارف بھی کروایا ہے۔ استاد بخاری کے درجِ ذیل نعتیہ قطعے پر ان کا مضمون مکمل ہوا:

جنت بھی وہ ہے جہاں آپ ٹہلتے ہوں گے وہ جنتی! جن سے آپ ملتے ہوں گے
دوزخ کے دل پر تو پڑتی ٹھنڈک ہوگی اس کو دیکھ کر آپ ہنستے ہوں گے

(ترجمہ، ص ۱۲۸)

نعتیہ شاعری کے فروغ میں سندھ کو بالعموم اور کراچی کو بالخصوص نمایاں مقام حاصل ہے۔ یہاں نہ صرف نعتیہ شاعری پر کتابیں شائع کی گئیں بلکہ نعتیہ شاعری کو پرکھنے اور اس میں غیر ارادی طور پر در آنے والی زبان و بیان کی بے احتیاطیوں پر گفتگو کا سلسلہ بھی ''نعت رنگ'' کے کتابی سلسلے میں اپریل ۱۹۹۵ء سے شروع ہوا اور بعد ازاں اس روش کی پیروی میں متعدد کتب بھی شائع کی گئیں۔ دبستانِ وارثیہ، کراچی کی جانب سے ہر ماہ ''ردیفی'' مشاعروں کا بندوبست ہوتا ہے۔ کراچی کے نعت گو متخصصین کی تعداد بھی حیران کن ہے اور عام شعرا کا نعتیہ اندوختہ بھی لائق توجہ ہے۔ ماہر القادری سے صبیح رحمانی تک بے شمار ایسے شعرا کے نام آتے ہیں جن کی شاعری میں سوز و گداز، فنی مہارت، شعری دروبست اور شرعی احتیاط کے اثرات نمایاں ہیں۔

غیر مسلم شعرا کی نعتیہ تخلیقات کی جمع آوری کا کام نہایت سلیقے سے کراچی میں نور احمد میرٹھی نے کیا اور ''بہر زماں بہر زباں'' کے عنوان سے وہ نعتیہ اندوختہ، کتابی صورت میں پیش کیا۔

تقدیسی شاعری میں ''مناقب'' کا بھی ایک مقام ہے۔احادیث کی کتب میں درج عنوانات کی متابعت میں، منقبت نگاری، کا آغاز ہوا۔تقریباً تمام احادیث کی کتب میں خلفاے راشدین، ازواجِ مطہرات اور اہلِ بیت کے مناقب پائے جاتے ہیں۔وجہِ تخلیقِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے حضرت حسّان بن ثابت سے فرمائش کر کے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی منقبت کے اشعار سماعت فرمائے تھے جو دیوانِ حضرت حسان بن ثابت انصاری میں صحیح سند کے ساتھ درج ہیں:

اس منقبت کے ایک دو اشعار کا منثور ترجمہ پیشِ خدمت ہے:

> دشمن نے پہاڑ پر چڑھ کر جس غار کا چکر لگایا تھا اس میں پناہ لینے والے حضور ﷺ کے ساتھ دوسرے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی تھے۔وہ رسول اللہ کے محبوب ہیں اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ مخلوق میں کوئی ان کے برابر نہیں ہوسکتا۔نبی پاک ﷺ کے بعد سب سے زیادہ متقی، پاک باز، وعدے کو پورا کرنے والے اور امانت داری کرنے والے ابوبکر صدیقؓ ہیں۔
>
> حضور ﷺ نے یہ اشعار سماعت فرمائے تو تین مرتبہ ارشاد فرمایا، ''اے حسان! تم نے بالکل سچ کہا، میرے ساتھی کو بلا لاؤ۔'' (دیوانِ حضرت حسّانؓ، ص ۳۸۶)

عرب میں منقبت نگاری شروع ہوئی تو عجم میں سندھ ہی کی سرزمین ہے جس میں یہ رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ سندھ میں شعراے کرام نے خلفاے راشدین اور اصطلاحی اہلِ بیت کے مناقب لکھے ہیں۔مناقب پر مشتمل متعدد کتب بھی منظرِ عام پر آئی ہیں جن میں منظر عارفی کی کتابیں ''مناقبِ امام حسین اور شعرائے کراچی'' اور ''مناقبِ خلفائے راشدین اور شعرائے کراچی'' لائقِ ذکر ہیں۔ان دونوں کتابوں کی اشاعت، نعت ریسرچ سینٹر، کراچی کے زیرِ اہتمام ہوئی ہے۔

بزرگانِ دین کے اعراس پر بعض خانقاہوں میں منقبتی مشاعرے ہوتے ہیں۔کراچی میں خانقاہِ تاجیہ میں بابا تاج الدین رحمۃ اللہ علیہ اور آپؒ کے خلیفہ حضرت بابا یوسف شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی جناب میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کی غرض سے مناقبوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

مرثیہ بھی تقدیسی شاعری کے ذیل میں آتا ہے۔ضمیر اختر نقوی کی کتاب ''اردو مرثیہ پاکستان میں'' کے مشتملات میں سندھ کے شعرا کا حصہ بڑا وقیع ہے۔جوش ملیح آبادی، سید آلِ رضا، نسیم امروہوی وغیرہم کو اس کتاب میں ''جدید مرثیے کے معماروں میں شمار کیا گیا ہے''، جن کا تعلق کراچی سے ہے۔دبستانِ کراچی کے مرثیہ نگاروں میں آرزو لکھنوی سے مصطفیٰ زیدی تک متعدد شعرا کا ذکر بھی ہے اور مرثیے کے نمونے بھی۔رحمٰن کیانی کی شہرت ''رزمیہ'' شاعری کی بنا پر ہوئی۔انھوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خطبے کے چند الفاظ مسدس میں ڈھالے ہیں:

میں ہوں حسین ابنِ علی جانتے ہو تم   جانِ بتول و سبطِ نبی جانتے ہو تم
اور کون ہے یزیدِ شقی، جانتے ہو تم   نیکی کدھر، کدھر ہے بدی جانتے ہو تم

مومن اگر ہو آؤ مری پیروی کرو
ورنہ سروں میں جو ہے سمائی وہی کرو
نوکر ہو مانتا ہوں مگر نوکری میں بھی
اچھے بُرے کا فرق اُصولاً ہے لازمی
روٹی پہ روٹی رکھ کے وہی کھائے آدمی
نیکی کا حوصلہ ہو کمائی حلال کی
جس نوکری کا ظلم و ستم پر قیام ہے
وہ نوکری غلط ہے، وہ روزی حرام ہے

(ضمیر اختر نقوی، اردو مرثیہ پاکستان میں، سید اینڈ سید، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۳۹۴)

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خطبے کے یہ الفاظ ہر عہد کے لیے قندیلِ ہدایت ہیں۔

میں نے انتخابِ حمد و نعت، مناقب اور مرثیے کے مختلف مجموعے دیکھے ہیں لیکن بہت کم شعری تخلیقات کو شعری و شرعی یا Poetic and Textual سطح پر ''معیاری'' پایا ہے۔ ناقدین کو چاہیے کہ کسی مجموعۂ کلام پر رائے دینے سے قبل ''متنی'' اور ''اظہاری'' معیارات پیشِ نظر رکھیں اور کتاب کو طباعت سے قبل، اغلاط و اسقام پاک کروانے کی سعی فرمائیں!

(نوٹ: یہ مقالہ، قومی ورثہ و ثقافت ڈویژن، اکادمی ادبیاتِ پاکستان، کراچی کے زیرِ اہتمام ہونے والی کانفرنس میں ہفتہ: ۲۶/اپریل ۲۰۲۵ء کو پاکستان نیشنل میوزیم کے آڈیٹوریم [کراچی] میں پیش کیا گیا۔)

کتابیات

۱۔ ابنِ منصور حلاج، ''کتاب الطواسین''، رنگ برنگ طیلساں، سید نعمان الحق، مکتبۂ دانیال، عبداللہ ہارون روڈ، کراچی، ۲۰۲۴ء

۲۔ حمایت علی شاعر، ''صریرِ خامہ''، شعبۂ اردو سندھ یونی ورسٹی، ۱۹۷۸ء

۳۔ صبیح رحمانی، ''پاکستانی زبانوں میں نعت: روایت و ارتقا''، نعت ریسرچ سینٹر، کراچی، ۲۰۱۷ء

۴۔ نور احمد میرٹھی، ''بہر زماں بہر زباں''، ادارۂ فکرِ نو، کراچی، ۱۹۹۶ء

۵۔ غوث میاں، ''انتخابِ حمد''، حضرت حسّان بک بینک پاکستان، کراچی، جولائی ۱۹۹۸ء

۶۔ طاہر حسین طاہر سلطانی، ''جہانِ حمد''، جہانِ حمد پبلی کیشنز، کراچی، اکتوبر ۲۰۲۰ء

۷۔ ایضاً، ''ارمغانِ حمد''، جہانِ حمد پبلی کیشنز، کراچی، فروری ۲۰۱۷ء

۸۔ شاعر علی شاعر، ''ہزار حمد''، رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۲۴ء

۹۔ ایضاً، ''حمد کے سات رنگ''، ایضاً، ۲۰۲۴ء

۱۰۔ نور احمد میرٹھی، ''گلبانگِ وحدت''، ادارۂ فکرِ نو، کراچی، ۲۰۰۷ء

۱۱۔ مولانا محمد اویس سرور، ''دیوانِ حسّان بن ثابتؓ''، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، س۔ن

۱۲۔ ضمیر اختر نقوی، ''اردو مرثیہ پاکستان میں''، سید اینڈ سید، کراچی، ۱۹۸۲ء

محمد الیاس الاعظمی ❁

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C, Latifabad, Hyderabad.

ڈاکٹر احمد علی برقیؔ اعظمی اور اُن کی فارسی شاعری

ڈاکٹر احمد علی برقیؔ اعظمی (۱۹۵۴-۲۰۲۲ء) اردو و فارسی کے خوش فکر اور قادر الکلام شاعر تھے اور نہایت پرگو شاعر کی حیثیت سے ادبی دنیا میں معروف تھے۔ وہ اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے۔ ۲۵؍دسمبر ۱۹۵۴ء کو پیدا ہوئے۔ یہیں اردو و فارسی کی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم ہوئی۔ فارسی زبان و ادب سے انھیں بچپن سے بہت دلچسپی تھی۔ شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ سے بی اے فارسی مضمون کے ساتھ اور اردو سے ایم اے کیا۔ بعد ازاں ۱۹۷۷ء میں دہلی آگئے اور جے این یو نئی دہلی سے فارسی سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی۔ نگراں پروفیسر عبدالودود اظہر دہلوی تھے۔ ان کا ٹاپک: (Socio Political Trends in Persian Poetry of Costitutional Period of Iran) تھا۔ اس کے لیے انھوں نے ایران و افغانستان کا سفر کیا۔ پندرہ دن افغانستان میں رہے اور پانچ کے قریب ایران میں زبان، تہذیب و تمدن اور طرزِ معاشرت کا مطالعہ و مشاہدہ کرتے رہے۔

ان کے والد رحمت الٰہی برقؔ اعظمی (۱۹۱۱-۱۹۸۳ء) داغ اسکول کے نہایت قادر الکلام شاعر نوح ناروی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ اردو و فارسی دونوں میں وہ تاحیات دادِسخن دیتے رہے۔ ان کا ایک مجموعہ کلام ''تنویر سخن'' شائع ہوا ہے۔ ان کے تین صاحبزادوں نے شعر و شاعری سے شغف رکھا اور دادِسخن دی۔ بڑے صاحبزادے جناب شوکت علی خیر آبادی اور برکت علی صدیقی اب بھی دادِسخن دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر احمد علی برقیؔ اعظمی (۱۹۵۴-۲۰۲۲ء) نے اپنے بھائیوں میں زیادہ شہرت پائی۔ غرض:

ایں ہمہ خانہ آفتاب است

ڈاکٹر احمد علی برقیؔ نے دہلی میں فارسی کی اعلیٰ تعلیم کے بعد ۱۹۸۳ء میں آل انڈیا ریڈیو، نئی دہلی کے شعبۂ فارسی میں ملازمت اختیار کرلی اور ۲۰۱۴ء میں سبک دوش ہوئے۔ ریڈیو کے شعبۂ فارسی میں ان کے ذمہ اردو اور انگریزی سے فارسی میں ترجمہ اور اناؤنسری کا کام تھا۔ اس کام کے سبب ان میں فارسی زبان و ادب میں اور مہارت و صلاحیت ہوگئی۔ چناں چہ وہ مدۃ العمر اردو و فارسی میں دادِسخن دیتے رہے۔ ان کے دو شعری مجموعے ''روحِ سخن'' اور ''محشرِ خیال'' شائع ہوئے۔ جن کی ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ اتر پردیش اردو اکادمی اور دہلی اردو اکادمی کے علاوہ بعض دیگر اداروں نے بھی اپنے انعامات کا مستحق قرار دیا اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کی عزت افزائی کی۔

ڈاکٹر احمد علی برقیؔ مرحوم ہر بات کو موزوں اور شعر کے قالب میں ڈھال دیتے تھے۔ نہ جانے کتنے مشاعروں، مذاکروں اور رسم

❁ شائستہ منزل، ۶۴۱۔ پورہ خالص عقب آداس وکاس، اعظم گڑھ، ہندوستان۔ برقی ڈاک: azmi408@gmail.com

اجرا کے پروگراموں وغیرہ کی انھوں نے منظوم روداد لکھی اور انٹرنیٹ پر شائع کرائی۔ اس وقت لوگ ان منظوم کاوشوں کو ذرا کم اہمیت دیتے تھے مگر اب پورے ملک میں ایک بھی ایسا شاعر شاید ہی آپ کو ملے جو فوری طور پر منظوم رودادیں قلم بند کرا کے شائع بھی کرا سکے۔ بزرگ بتاتے تھے کہ زود گوئی کا یہی حال ان کے والد کا بھی تھا۔ البتہ وہ قصائد اسی طرح فی الفور قلم بند کرا دیتے تھے۔ بہرحال ڈاکٹر احمد علی پوری زندگی اردو میں دادِ سخن دیتے رہے، لیکن اصلاً وہ فارسی زبان و ادب کے مردِ میداں تھے۔

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی کا نام احمد علی رکھا۔ والد کے تخلص برق کی نسبت سے اپنا تخلص برقی رکھا، اعظمی اعظم گڑھ کی جانب نسبت ہے۔ یہ تخلص و نسبت ۱۵ رسال کی عمر میں شاعری کے آغاز میں اختیار کیا۔

ہم لوگ جب ان کی زبردست فارسی دانی اور کمال مہارت و دسترس کا ذکر کرتے تو وہ اکثر کہتے کہ میں نے فارسی درجہ تین سے پڑھی ہے۔ اور اسی اعظم گڑھ میں پڑھی ہے۔ وہ نہ صرف فارسی زبان و بیان پر حاوی تھے بلکہ لب و لہجے اور اور اسلوب و آہنگ پر بھی پورا عبور رکھتے تھے۔ وہ جب ریڈیو نشریات خبریں یا تجزیے پیش کرتے ایسا محسوس ہی نہیں ہوتا کہ کوئی ہندی نژاد شخص ہے بلکہ اس وقت ان کا لہجہ ایرانی الاصل معلوم ہوتا اور ان کی زبان سے سن کر ایسا محسوس ہوتا کہ یہ نئی دہلی کی نہیں ایران ریڈیو کی نشریات ہیں۔

ایک دلچسپ واقعہ جو خود میرے ساتھ پیش آیا وہ بھی سننے کے قابل ہے۔ انھوں نے علامہ شبلی پر تار سے ایک نظم بھیجی اور مجھے فون کیا کہ اسے ملاحظہ کر کے اپنی رائے دیجیے۔ میں کچھ پریشان ضرور ہوا، اس لیے کہ میرا ادبی ذوق سرے سے ذوق کہنے کے لائق نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سخن سنجی سے زیادہ مشکل سخن فہمی ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ چوں کہ میں نے کبھی کلاس کا منہ نہیں دیکھا تو اس معاملے میں اور بھی کورا ہوں۔ بہرحال کیا کرتا، قریب ہی ایک پی، سی، او، سے جہاں تار آیا ہوا تھا جا کر وہ نظم پرنٹ کرا لایا۔ وہ نظم یہ تھی:

ہے جہانِ علم میں شبلی نعمانی وہ نام — جس کے اعجازِ قلم کے ہر جگہ ہیں قدرداں
متفق اس بات پر ہیں آج اربابِ نظر — عصر حاضر میں بھی ان کی معنویت ہے عیاں
ہو رہے ہیں ان کی تخلیقات سے سب مستفید — ان کے طرزِ فکر کے ہیں قدرداں پیر و جواں
ان کی تصنیفات سے ہے بہرہ ور بر صغیر — مستند اور معتبر ہے ان کا اندازِ بیاں
میں نے بھی برسوں کیا ہے ان سے برقی کسبِ فیض — ہر طرف پھیلے ہیں جو ان کے نقوش جاوداں

ابھی میں گھر بھی نہیں پہنچا تھا کہ ان کا دوبارہ فون آ گیا اور پوچھا کیسی نظم ہے؟ میں نے اب تک وہ نظم دیکھی نہیں تھی۔ خود کو بچانے کے لیے کہہ دیا کہ اردو میں کیا کہتے ہیں فارسی میں کہیے۔ وہ خاموش ہو گئے، لیکن چند ہی منٹ بعد دوبارہ فون کر کے کہا اب دیکھ کر بتائیے۔ مرتا کیا نہ کرتا دوبارہ پرنٹ نکلوایا تو حیرت کی انتہا نہ رہی کہ محض چند منٹ بعد فارسی نظم بھیج دی جو اگرچہ پہلی نظم کا منظوم فارسی ترجمہ ہے لیکن یہ کمال کچھ کم حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ منظوم ترجمہ یہ ہے:

نامِ شبلی در صفِ نام آوران — کارِ شبلی مرجعِ دانشوران
سبکِ او در نقدِ شعرِ فارسی — در روانی ہمچو بحرِ بیکران

بر سپہر فارسی ''شعر العجم'' — می درخشد ہمچو ماہِ ضو فشان
ذکرِ او پیداست در شعرِ بہار — ہست او در وصفِ او رطب اللسان
شاہکارِ اوست در شعر و ادب — منبعِ دانش در اقصای جہان
می سراید نغمہ ہای دلپذیر — عندلیبِ گلشنِ ہندوستان
نخلبندِ گلشنِ مہر و وفا — فخرِ دوران نکتہ سنج و نکتہ دان
'شبلی کالج'، مظہرِ فیضانِ اوست — 'شبلی منزل' ہست گنجِ شایگان
می کنند از یادگارش کسبِ فیض — دوستدارانِ معارف در جہان
نامِ او احمد علی باشد مدام — در جہانِ علم و دانش جاودان

شعروادب میں مہارت ومشاقی علاحدہ رہی شعر وادب میں ایسی دیوانگی اوروارفتگی بھی بے مثال تھی، کم ازکم جن شعراسے میرا واسطہ اور رابطہ رہاہے ان میں تونہیں دیکھی۔ نامورادیب رشید احمد صدیقی (۱۸۹۴ء۔ ۱۹۷۷ء) نے لکھاہے کہ مولانا اقبال سہیل (۱۸۸۴۔۱۹۵۵ء) کے یہاں یہ وصف پایا جاتا تھا۔وہ شعروادب میں کمال کودنیا کا سب سے بڑا کمال سمجھتے تھے۔

ہندوستان میں اپنے عہد میں انھوں نے فارسی زبان کی کئی لحاظ سے خدمت انجام دی۔

۱۔ فارسی زبان میں شاعری کی۔ان کے مجموعہ کلام میں فارسی میں نعت اور غزلیں دونوں موجود ہیں۔

۲۔ ہندوبیرون ہند کے قدیم اورنامور شعرااوادبا کی نعتوں اورغزلوں کے منظوم تراجم لکھے۔

۳۔ متعددقدیم فارسی شعرا کی غزلوں کے مفہوم اردو میں منظوم کرکے شائع کیے۔

ان پہلوؤں سے ڈاکٹراحمدعلی برقی کے نمونے یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔خوف طوالت سے محض ایک یادوشعرہی نقل کرنے پراکتفا کیا گیاہے۔تمام کلام علاحدہ کسی اورموقعے پر شائع کیا جائے گا۔اس تحریرکوڈاکٹراحمدعلی برقی اعظمی مرحوم کے فارسی کلام کادیباچہ تصور کرنا چاہیے۔

۱۔ فارسی نعت

وجہِ وجودِ کون و مکاں سید البشر ﷺ — رطب اللساں بہ وصفِ تو ہستند بحر و بر
مثلِ تو نیست دیگری در جملہ کائنات — ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر''
ایں ہم رود بسوی مدینہ ز فضلِ رب — برقی شود ز فرصتِ دیدار بہرہ ور

نازشِ دوراں نظامِ مصطفیٰ است — ''آبروئی ما ز نامِ مصطفیٰ است''
مدح خوانش ہست ربِ کائنات — حاملِ قرآں نظامِ مصطفیٰ است

در جہان آب و گل برقی مدام حکم فرما فیضِ عامِ مصطفیٰ است

۲۔غزلیات

ہستم در انتظار تو ای جان من بیا ای رشک گلعذار بیا در چمن بیا
دامن کشاں مرو ز دلِ بیقرارِ من با صد خرامِ ناز چو سرو و سمن بیا

تو مثلِ شاہ ہستی من گدایم خدارا گوش کن ایں التجایم
وجودِ خویش را کردم فراموش از آن روزی کہ با تو آشنایم

مرد و زن پیر و جواں را داشتہ ہفتاد و دو کاروانِ جانسپاری کاروانِ کربلاست

۳۔شعرا کے کلام کے منظوم تراجم

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی مرحوم نے جن فارسی شعرا کا کلام اردو میں منظوم کیا ہے ان کے نام اور نمونہ کلام درج ذیل ہیں:

حافظ شیرازی، امیر خسرو، مولانا عبدالرحمٰن جامیؔ، فخر الدین عراقی، سر سید احمد خاں، علامہ شبلی نعمانی، علامہ سر محمد اقبال، جگر مرادآبادی اور حضرت امام خمینی، وغیرہ۔

حافظ شیرازی فارسی غزل کے باوا آدم ہیں۔ان کی ایک غزل کا منظوم اردو ترجمہ اور ایک دوسری غزل کا مفہوم اردو میں منظوم کیا ہے۔نمونہ یہ ہے:

حافظ شیرازی	احمد علی برقی
آناں کہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند	اے کاش مجھ پہ بھی وہ نگاہِ کرم کریں
آیا بود کہ گوشۂ چشمی بہ ما کنند	کرتے ہیں اک نظر میں جو مٹی کو کیمیا
حافظ دوام وصل میسر نمی شود	حافظؔ ہمیشہ وصل نہیں ہے نصیب میں
شاہاں کم التفات بہ حالِ گدا کنند	ہوتے ہیں لطفِ شاہ سے کم بہرہ ور گدا

۲۔امیر خسرو(۱۲۵۳۔۱۳۲۵ء) ڈاکٹر احمد علی برقی کے محبوب شاعر ہیں۔ان کی ایک سے زیادہ غزلوں کے منظوم تراجم کیے ہیں۔نمونہ:

امیر خسرو	ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی کا منظوم اردو ترجمہ
نمی دانم چہ منزل بود شب جائیکہ من بودم	تھی وہ نامعلوم منزل تھا جہاں کل رات کو

بہ ہر سو رقص بسمل بود شب جائیکہ من بودم	ہر طرف تھا رقصِ بسمل تھا جہاں کل رات کو
پری پیکر نگارے سرو قدے لالہ رخسارے	لالہ رو اور سرو قد تھا اک پری پیکر وہاں
سراپا آفتِ دل بود شب جائیکہ من بودم	سر سے پا تک آفتِ دل، تھا جہاں کل رات کو
رقیباں گوش بر آواز، او در ناز و من ترساں	تھی مجھے وحشت وہاں موجود تھے میرے رقیب
سخن گفتن چہ مشکل بود شب جائیکہ من بودم	بات بھی کرنی تھی مشکل، تھا جہاں کل رات کو
خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسروؔ	میر مجلس لامکاں میں تھا وہاں خسروؔ خدا
محمد شمع محفل بود شب جائیکہ من بودم	تھے محمدؐ شمع محفل تھا جہاں کل رات کو

(۲)

ابر می بارد و من می شوم از یار جدا	ابر باراں میں ہے اب مجھ سے مرا یار جدا
چوں کنم دل بہ چنیں روز ز دلدار جدا	کیا کروں ایسے میں جب مجھ سے ہو دلدار جدا
ابر و باراں و من و یار ستادہ بہ وداع	میں الگ روتا ہوں روتا ہے الگ یار جدا
من جدا گریہ کناں، ابر جدا، یار جدا	باغ سرسبز ہے، موسم ہے حسیں، سبزہ جواں

(۳)

خبرم رسید امشب کہ نگار خواہی آمد	خبر ملی ہے کہ تو اے نگار آئے گا
سرِ من فدائی راہی کہ سوار خواہی آمد	فدائے جادہ ہوں جس سے سوار آئے گا

نورالدین عبدالرحمٰن جامی (۱۴۱۴-۱۴۹۲ء) کی ایک غزل کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ نمونہ یہ ہے:

عبدالرحمٰن جامیؔ	احمد علی برقی
ایں قدر مستم کہ از چشمم شراب آید بروں	اس قدر ہوں مست آنکھوں سے چھلکتی ہے شراب
وز دلِ پُر حسرتم دودِ کباب آید بروں	اٹھتا ہے حسرت بھرے دل سے مرے دودِ کباب
ماہ من در نیم شب چوں بی نقاب آید بروں	جب نکلتا ہے مرا یہ چاند آدھی رات کو
زاہدِ صد سالہ از مسجد خراب آید بروں	زہد زاہد کا بھی ہو جاتا ہے مسجد میں خراب

فخرالدین ابراہیم عراقی (۱۲۱۳-۱۲۸۹ء) کی شاعری بھی ان کے نزدیک اہمیت کی حامل تھی، چناں چہ ان کی بھی بعض غزلیں منظوم کی ہیں۔ نمونہ یہ ہے:

فخرالدین عراقی	احمد علی برقی
نخستیں بادہ کاندر جام کردند	شراب معرفت کا جو دیا جام
ز چشمِ مست ساقی وام کردند	وہ چشمِ مست ساقی سے لیا وام

چو با خود یافتند اہلِ طرب را | ملے اہلِ طرب جب ان سے، ان کو
شرابِ بیخودی در جام کردند | شرابِ بے خودی کا دے دیا جام

مرزا غالب (۱۷۹۷-۱۸۶۹ء) اردو والوں کے سب سے چہیتے ہیں۔ اگرچہ ان کو شہرت دوام کی دولت اردو ہی سے ملی، تاہم وہ اپنی فارسی شاعری کے بالمقابل اردو شاعری کو کم تر سمجھتے تھے اور چاہتے تھے اہلِ ذوق ان کی فارسی دانی سے لطف اندوز ہوں۔ ڈاکٹر احمد علی برقی نے ان کے متعدد اشعار کو اردو قالب عطا کیا ہے۔ نمونہ درج ذیل ہے:

مرزا غالب	احمد علی برقی
فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ	فارسی دیکھو جو چاہو نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اردو کہ بے رنگِ من است	چھوڑو اردو کو کہ یہ بے رنگ ہے میرا کلام

(۲)

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ	مجھ کو یہ مرتبہ منظور نہیں تھا غالبؔ
شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فن ما	شعر نے خود یہی چاہا کہ مرا فن بن جائے

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ سرسید احمد خاں (۱۸۹۷-۱۸۹۸ء) بھی فارسی میں دادِ سخن دیتے تھے۔ احمد علی برقی اعظمی کے منظوم ترجمے سے یہ راز بھی فاش ہوتا ہے۔ سرسید کی غزل کے دو شعر اور ان کا منظوم اردو ترجمہ درج ذیل ہے۔

سرسیّد	احمد علی برقی
فلاطوں طفلکے باشد بہ یونانے کہ من دارم	فلاطوں اک مرے یونان کا طفلِ دبستاں ہے
مسیحا رشکِ می آرد بہ درمانے کہ دارم	مسیحا کو بھی جس پر رشک ہے وہ میرا درماں ہے
ز کفرِ من چہ میخواہی ز ایمانم چہ می پرسی	میں کافر ہوں کہ مومن اس سے آخر تم کو کیا مطلب
ہمہ یک شعلۂ عشق است ایمانے کہ من دارم	سراپا ایک سوزِ عشق میرا نورِ ایماں ہے

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) کی فارسی شاعری کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء-۱۹۵۸ء) نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کا خاتمہ مرزا غالب پر نہیں بلکہ مولانا شبلی کی فارسی شاعری پر ہوا۔ ان کے اس قول سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ فارسی کے کس درجہ بلند رتبہ شاعر تھے۔

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی نے ان کی متعدد غزلوں کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے۔ یہ میری ہی حماقت تھی کہ میں نے ان کو یہ بتا دیا کہ شبلی کی فارسی غزلوں کو منظوم اردو جامہ اکبر علی خاں عرشی زادہ (۱۹۳۹-۱۹۹۷ء) پہنا چکے ہیں اور وہ گوپال متل (۱۹۰۶-۱۹۹۳ء) ماہانہ رسالہ 'تحریک' میں شائع ہو چکا ہے۔ (اب تو خیر سے وہ رام پور سے کتابی صورت میں بھی طبع ہوگیا ہے۔) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند غزلوں کے بعد انھوں نے علامہ شبلی کی فارسی غزلوں سے ہاتھ اٹھالیا۔ علامہ شبلی کی ایک فارسی غزل کے چند شعر اور اس کا منظوم اردو

ترجمہ ملاحظہ کیجیے:

شبلی	احمد علی برقی
من کہ در سینہ دلی دارم وشیدا چہ کنم	ہے جو سینے میں دل شیدا بتا میں کیا کروں
میل با لالہ رخاں گر نہ کنم تا چہ کنم	گر حسینوں سے نہ رکھوں رابطہ میں کیا کروں
من نہ آنم کہ بہ ہر شیوۂ دل از دست دہم	وہ نہیں ہوں ہر ادا پر اس کی دے دوں اپنی جان
لیک با آص نگہہ حوصلہ فرسا چہ کنم	حوصلہ فرسا نگاہوں کا بتا میں کیا کروں
ہست چہل سال کہ بیہودہ نگہ داشتمس	پاس ہو بیکار میرے جب وہ چالیس سال سے
گرنہ بر سنگِ زنم شیشۂ تقویٰ چہ کنم	گر نہ ٹوٹے شیشۂ تقویٰ، بتا میں کیا کروں

شاعر مشرق علامہ اقبال (۱۸۷۷-۱۹۳۸ء) کے میلادِ آدم کو انھوں اردو لباس عطا کیا ہے۔ بعض قطعات کو بھی اردو میں منتقل کیا ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:

علامہ اقبال	احمد علی برقی
سخن درشت مگو، در طریق یاری کوش	زباں درازی نہ کر دوستی کی کوشش کر
کہ صحبت من و تو در جہاں خدا ساز است	خدا نے ہم کو بنایا ہے دوستی کے لیے

قطعہ فارسی: علامہ اقبال	منظوم اردو ترجمہ: احمد علی برقی اعظمی
میارا بزم بر ساحل کہ آنجا	بزم آرائی لب ساحل نہ کر
نوائے زندگانی نرم خیز است	ہے نوائے زندگی مدھم وہاں
بدریا غلط و با موجش در آویز	کر تلاطم خیز موجوں سے نبرد
حیاتِ جاوداں اندر ستیز است	کشمکش میں ہے حیات جاوداں

ہماری شاعری جن شعرا کی بدولت آبرومند ہوئی ان میں جگر مرادآبادی (۱۸۹۰-۱۹۶۰) کا نام بہت نمایاں ہے۔ ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی نے اولاً ان کی بحر میں ایک غزل ان کی نذر کی۔ پھر دوسری غزل کو منظوم کیا۔ ممکن ہے ان کی اور بھی غزلیں منظوم اردو تراجم ویب سائٹس پر ہوں اور ناچیز کی وہاں تک رسائی نہ ہوسکی ہو۔ جگر کی ایک غزل کے دو شعر اور اس کے ترجمے سے محظوظ ہوں:

جگر مرادآبادی	احمد علی برقی
کعبہ در پائے یار دیدم دوش	یار کے پاؤں پہ کل رات کو کعبہ دیکھا
ایں چہ گفتی جگر خموش خموش	کیا کہا تو نے جگر پھر سے بتا کیا دیکھا
حسن پنہاں و جلوہ ھاست بجوش	حسن پنہاں ہے مگر اس کے ہیں جلوے پر جوش

اصل خاموش و فرع ها بخروش — اصل خاموش ہے پر فرع کو گویا دیکھا

ایران کے روحانی عالم اورانقلاب ایران رہنما سید روح اللہ خمینی معروف بہ امام خمینی (۱۹۰۲-۱۹۸۹ء) کی کئی غزلیں ڈاکٹر برقی نے اردو میں منظوم کیں۔ اصل غزلوں کے ایک دو اشعار اوران کے منظوم تراجم یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

امام خمینی	احمد علی برقی
رازی است مرا، راز گشایی خواهم	راز کا اپنے میں اک راز کشا چاہتا ہوں
دردی است به جانم و دوایی خواهم	مجھ کو درد ہے میں اس کی دوا چاہتا ہوں
گر طور ندیدم و نخواهم دیدن	طور دیکھا نہیں خواہش بھی نہیں ہے اس کی
در طور دل از تو جای پایی خواهم	دل میں جو طور ہے اس میں تری جا چاہتا ہوں

(۲)

من به خالِ لبت، ای دوست گرفتار شدم	خال لب پر ترے اے دوست گرفتار ہوا
چشم بیمار تو را دیدم و بیمار شدم	چشم بیمار تری دیکھ کے بیمار ہوا

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی اپنے عہد کے بعض ملکی اور بعض ایرانی شعرا اور اپنے عہد کی فارسی پر نظر رکھتے۔ ایک ایرانی شاعرہ فروغ فرخزاد (۱۹۳۴-۱۹۶۷ء) کے دوشعر کے منظوم اردو ترجمہ اور مرزا محمد تقی ملک الشعرا بہار (۱۸۸۶-۱۹۵۱ء) کے کلام کے منظوم اردو تراجم سے ان خصوصیات کا اندازہ ہوتا ہے۔

فروغ فرخزاد	احمد علی برقی اعظمی
پیشانی از ز داغ گناهی سیه شود	داغ گنہہ سے تیری جبیں ہے اگر سیاہ
بهتر زداغ مهر نماز از سرِ ریا	بہتر ہے اس نماز سے جو ہے پر از ریا
نام خدا نبردن از آن به که زیرِ لب	شایاں نہیں ہے نام خدا اس کے زیرِ لب
بهر فریب خلق بگوئی خدا، خدا!	کہتا ہے جو زبان سے ہر دم خدا خدا

ایران کے ایک نامور شاعر بلکہ ملک الشعرا بہار کے فارسی قطعہ کا منظوم اردو ترجمہ درج ذیل ہے:

ملک الشعرا بہار	احمد علی برقی اعظمی
سحر گه به راهی یکی پیر دیدم	دکھائی دیا راہ میں ایک بوڑھا
سوی خاک خم گشته از ناتوانی	جھکی تھی کمر از روئے ناتوانی
بگفتم، چه گم کردهٔ ای اند رین ره؟	جو پوچھا کہ رستے میں کیا کھو گئے ہو
بگفتا، جوانی جوانی جوانی	تو بولا' جوانی جوانی جوانی

طبع زادغزلوں اورتراجم کے ان نمونہ جات سے ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی کی فارسی دانی اور فارسی شعر و ادب کا بخوبی اندازہ

ہوجاتا ہے۔لیکن فارسی شاعری کا ایک اور پہلو ہے اور وہ شاید ان پہلوؤں پر حاوی ہوجائے۔ اور وہ ان کی فارسی نظمیں اور اعلام واشخاص پر قطعات تاریخ ہیں جو انھوں بعض نامور شعرا کی وفات پر لکھے ہیں۔ طوالت سے بچنے کے لیے محض دو ایک فارسی نظمیں یہاں نقل کی جاتی ہیں:

علامہ شبلی نعمانی

نامِ شبلی در صفِ نام آوران | کارِ شبلی مرجعِ دانشوران
سبکِ او در نقدِ شعرِ فارسی | در روانی ہمچو بحرِ بیکران
بر سپہر فارسی ''شعرالعجم'' | می درخشد ہمچو ماہِ ضو فشان
ذکرِ او پیداست در شعرِ بہار | ہست او در وصفِ او رطب اللسان
شاہکارِ اوست در شعر و ادب | منبعِ دانش در اقصای جہان
می سراید نغمہ ہای دلپذیر | عندلیبِ گلشنِ ہندوستان
نخلبندِ گلشنِ مہر و وفا | فخرِ دوران نکتہ سنج و نکتہ دان
'شبلی کالج' مظہرِ فیضانِ اوست | 'شبلی منزل' ہست گنجِ شایگان
می کنند از یادگارش کسبِ فیض | دوستدارانِ معارف در جہان
نامِ او احمد علی باشد مدام | در جہانِ علم و دانش جاودان

علامہ اقبال

شاعرِ مشرق زمیں با ذہن باز | می سراید نغمہ ہای دلنواز
شعرِ اقبال است روحِ شاعری | خاطراتش مظہرِ سوز و گداز
می رود از شرق تا مغرب زمیں | شہرتش در خطۂ دور و دراز
آبروی سرزمینِ ہند و پاک | می شود از کارہایش سرفراز
شعرِ او در ہر دو اردو فارسی | حاکی از درسِ عمل، سوز و گداز
مغز بیدارش در اقصای جہان | می گشاید بال و پر با شاہباز
سبک شعرش مظہرِ سوزِ دروں | ہست برقی فکرِ او تاریخ ساز

مہدی حسن

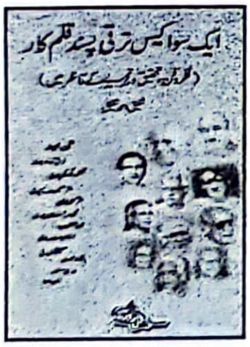
طوطیِ شکرِ فشان از دارِ فانی درگذشت | عندلیبِ گلشنِ شیرین بیانی درگذشت

آنکہ بودہ در صفِ نام آوران مہدی حسن　　با ہزاراں نغمہ ہای جاودانی درگذشت
روشنیٔ محفلِ اردو غزل خاموش شد　　رونقِ بزمِ نشاط و شادمانی درگذشت
قصر موسیقی شدہ خالی زِ فخرِ روزگار　　تاجدارِ کشورِ آوازخوانی درگذشت
از صدای دلنوازش آنکہ برتی اعظمی　　بود ہمچو چشم از راحت رسانی درگذشت

احمد فراز

ناگہان زین دارِ فانی درگشت احمد فراز　　بود اشعارش در اردو ترجمانِ سوز و ساز
او کہ بودہ در جہاں از چہرہ ہای سرشناش　　نغمہ ہای جاودانش مظہرِ سوز و گداز
داشت در اردو تبحر شاعرِ پشتو زبان　　سبکِ او در شعر اردو بود خیلی دلنواز
بازگو می شد بہ شعرش سرد و گرمِ روزگار　　بررسی می کرد روحِ عصر را با ذہنِ باز
او نہ تنہا بود منظورِ نظر در کشورش　　شہرتش گسترده شد در خط دور و دراز
گوی سبقت می ربود از دیگراں درراہِ عشق　　بود او در آرمانش حق پرست و راستباز
شعرہایش بود برتی مظہرِ سوزِ دروں　　او ہمیشہ بود از سود و زیانش بے نیاز

ان فارسی نظموں کے علاوہ بھی متعدد شعرا وادبا پر ان کی نظمیں ان کے ذخیرہ ادب میں شامل ہیں اور ان کی فارسی شعروادب پر گہری نگاہ کی گواہ بھی ہیں۔ ہندوستان میں فارسی شعروادب کے ختم ہوتے دور میں فارسی میں دادِ سخن دینا بلاشبہ ان کی بڑی جگر کاوی ہے۔



ایک سو اکیس ترقی پسند قلم کار

(فکروفن، تحقیق وتجزیے کے تناظر میں)

شفیق احمد شفیق

قیمت: ۳۵۰۰ روپے

انجمن ترقیِ اردو پاکستان، ایس ٹی ۱۰، بلاک ۱، گلستانِ جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی

ڈاکٹر رؤف پاریکھ ٭

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C, Latifabad, Hyderabad.

چند مشاہیرِ ادب کی درست تاریخ ہائے پیدائش و وفات

اردو میں حوالے کی متعدد کتب اور سوانحی لغات (biographical dictionaries) موجود ہیں جن میں مشاہیرِ ادب کی تاریخ ہائے پیدائش و وفات، حالاتِ زندگی اور تصانیف وغیرہ کا حال درج ہے۔ ان کتب کے ناموں اور ان سے متعلق دیگر معلومات کو یہاں درج نہیں کیا جارہا کیوں کہ راقم اپنے ایک مقالے میں ان کی تفصیل پیش کر چکا ہے۔[(۱)]

عرض یہ کرنا ہے کہ اردو کے کئی معروف اور اہم اہلِ قلم ایسے ہیں جن کی پیدائش و وفات کی تاریخیں یا تو درست نہیں ہیں یا ان کا کہیں ذکر تک نہیں ملتا۔ مثال کے طور فتح محمد جالندھری کی تاریخِ وفات کسی تحقیقی کام کے سلسلے میں درکار تھی۔ لیکن کسی ماخذ میں نہیں ملی۔ مالک رام نے فتح محمد جالندھری کا صرف سالِ پیدائش دیا ہے جو اُن کے مطابق ۱۸۶۴ء ہے[(۲)] لیکن انھوں نے اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ ہم نے کسی دوست سے اس کا ذکر کیا، انھوں نے سماجی ذرائع ابلاغ پر یہ سوال داغ دیا۔ جواب میں جو تاریخیں موصول ہوئیں وہ نہ صرف حوالوں سے عاری تھیں بلکہ بعض مضحکہ خیز حد تک غلط تھیں (ایک تاریخ تو ایسی بھی تھی جس کے مطابق فتح محمد جالندھری کا انتقال ۲۰۱۶ء میں ہوا تھا، گویا انھوں نے ایک سو بیالیس سال کے لگ بھگ عمر پائی۔ سماجی ذرائع ابلاغ میں ایک بڑا مسئلہ یہی ہے کہ سند، ثبوت اور حوالہ جیسے الفاظ سے ان ذرائع کے بیش تر استعمال کنندہ ناواقف ہیں)۔ کچھ نے ان کے ہم نام لوگوں کی تاریخِ پیدائش و وفات لکھ دی۔ فتح محمد جالندھری جیسے معروف قواعد نویس اور مترجمِ قرآن کی تاریخ ہائے پیدائش و وفات کا یہ حال ہے تو باقی کا کیا پوچھنا۔

اسی طرح بعض اہلِ قلم کی تاریخوں میں بعض تسامحات ہیں لیکن ان کی غلط تاریخیں اتنی مشہور ہوگئی ہیں کہ تحقیقی مقالوں میں بھی انھیں اسی طرح لکھ دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طالب علموں کو ایک مقررہ وقت پر اپنا مقالہ جمع کرانا ہوتا ہے اور اس محدود وقت میں وہ اپنی اصل تحقیق کو چھوڑ کر کسی اہلِ قلم کی درست تاریخوں کے لیے درجن بھر کتابوں کی ورق گردانی نہیں کر سکتے لہٰذا عام طور پر دست یاب اور رائج تاریخوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ بسا اوقات کسی تعلیمی سند (ڈگری) یا اسکول کے رجسٹر میں درج تاریخ اور حقیقی تاریخ میں بھی فرق ہوتا ہے۔ لہٰذا یہاں چند ایسے مشاہیر ادب کا ذکر کیا جارہا ہے جن کی تاریخِ پیدائش یا وفات میں اغلاط پائی جاتی ہیں مگر وہ ہر جگہ لکھی جارہی ہیں۔ ساتھ ہی یہاں درست تاریخیں حوالوں کے ساتھ درج کی جارہی ہیں۔ عرض ہے کہ جن اہلِ علم نے تحقیق کے بعد وفیات کی کتابیں یا تاریخ وسوانح کی کتابیں تحریر کی ہیں ان کا ہم پر احسان ہے اور ان پر تنقید یا ان کی تنقیص

٭ سابق استاد، شعبۂ اردو، جامعہ کراچی۔ drraufparekh@yahoo.com

مقصود نہیں ہے بلکہ درست تاریخوں کو دریافت کرنا مطلوب ہے۔

ابنِ صفی (اصل نام: اَسرار احمد)

معروف جاسوسی ناول نگار، شاعر اور مزاح نگار ابنِ صفی کی تاریخِ پیدائش عام طور پر ۲۶ر جولائی ۱۹۲۸ء بتائی جاتی ہے۔ مثلاً ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ نے یہی تاریخ دی ہے۔[۳] احمد حسین صدیقی نے بھی اسی کو دہرایا ہے۔[۴] لیکن یہ تاریخ درست نہیں ہے اور منیر احمد سلیچ نے تحقیق کے بعد اپنی ایک اور کتاب میں ابنِ صفی کی درست تاریخِ پیدائش یعنی اپریل ۱۹۲۸ء درج کی ہے۔[۵] راشد اشرف نے وضاحت کی ہے کہ ابنِ صفی نے اپنے مضمون بعنوان 'بقلم خود' میں اپنی تاریخِ پیدائش کے بارے میں لکھا ہے ''اپریل ۱۹۲۸ء کی کوئی تاریخ''۔ یہ تحریر 'الف لیلہ ڈائجسٹ' (کراچی) کے شمارہ جولائی ۱۹۷۲ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی اور محمد فیصل نے بھی اپنی کتاب میں ابنِ صفی کی اسی تحریر کا حوالہ دیا ہے۔[۶] اصولاً اسی تاریخ کو درست مانا جانا چاہیے، تاوقتے کہ اس کے برخلاف کوئی شہادت یا سند نہیں ملتی۔

البتہ ابنِ صفی کا انتقال ۲۶ر جولائی ۱۹۸۰ء کو ہوا۔[۷]

جمیل جالبی (اصل نام: محمد جمیل خاں)

جمیل جالبی کی تاریخِ پیدائش عام طور پر یکم جولائی ۱۹۲۹ء لکھی جاتی ہے۔ 'ارمغان' (کراچی) کے جمیل جالبی نمبر میں یہی تاریخ درج ہے اور جائے پیدائش سہارن پور لکھی گئی ہے۔[۸] البتہ جالبی صاحب پر مرتبہ ایک کتاب میں یہی تاریخ لکھ کر وضاحت کی گئی ہے کہ اسناد میں یہ تاریخ درج ہے۔[۹] اکادمی ادبیات کی 'اہلِ قلم ڈائریکٹری ۲۰۱۰ء' میں بھی یہی تاریخ لکھی ہے۔[۱۰] لیکن جالبی صاحب کی یہ تاریخِ پیدائش درست نہیں۔ عبدالعزیز ساحر کی تحقیق ہے کہ جمیل جالبی ۱۲ر جون ۱۹۲۹ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔[۱۱]

جمیل جالبی کا انتقال ۱۸ر اپریل ۲۰۱۹ء کو ہوا۔[۱۲]

حجاب اسمٰعیل (بعد ازاں: حجاب امتیاز علی)

حجاب اسمٰعیل رحجاب امتیاز علی کی تاریخِ پیدائش ایک معتا رہی ہے کیوں کہ وہ خود بھی اسے مخفی رکھنا چاہتی تھیں اور اسی لیے مختلف مآخذ میں ان کی مختلف تاریخِ پیدائش ملتی ہے جو ۱۹۰۳ء سے ۱۹۲۰ء کے درمیان بتائی گئی ہے۔[۱۳] منیر احمد سلیچ نے ایک جگہ حجاب اسمٰعیل رحجاب امتیاز علی کی ولادت کے زیرِ عنوان لکھا ''۱۹۰۳ء حیدر آباد دکن''۔[۱۴] لیکن انھوں نے اپنی ایک اور کتاب میں حجاب کی ولادت کے تحت لکھا ''۴ر نومبر ۱۹۰۸ء، بڑی پیٹ وانم باڑی ضلع شالی ارکاٹ (ریاست تامل ناڈو)''۔[۱۵]

مرزا حامد بیگ نے حجاب کی پیدائش کے ضمن میں لکھا ہے ''لگ بھگ ۱۹۰۳ء بمقام حیدر آباد دکن''۔[۱۶] پھر حواشی میں واضح کیا ہے کہ یہ تاریخ مختلف تحریروں اور سجاد حیدر یلدرم کے اس سہرے کے مطابق ہے جو انھوں نے حجاب اور امتیاز علی تاج کی شادی پر

کہا تھا نیز یہ کہ حجاب نے اس تاریخ سے انکار نہیں کیا لیکن ایک خط میں لکھا کہ انھوں نے یہ عہد کیا ہے کہ اپنی تاریخ پیدائش کسی کو نہیں بتائیں گی۔[۱۷] البتہ اس کتاب کے ہندوستانی ایڈیشن میں حامد بیگ صاحب نے حجاب کی تاریخ پیدائش ۴ر نومبر ۱۹۰۸ء لکھی ہے۔[۱۸] پھر حواشی میں لکھا ہے کہ حجاب کی بیٹی اور داماد کے مطابق ان کی تاریخ پیدائش ۴ر نومبر ۱۹۰۸ء ہے۔ نیز یہ کہ حجاب کے پاسپورٹ پر ان کی تاریخِ پیدائش ''۸ر نومبر 1918ء درج ہے جو سراسر غلط ہے۔''[۱۹]

غفور شاہ قاسم نے لکھا ہے کہ خاندانی ذرائع اور حجاب کی اپنی ڈائری کے مطابق ۴ر نومبر ۱۹۰۸ء ان کی درست تاریخِ پیدائش ہے اور ان کی جاے پیدائش بھی حیدرآباد دکن نہیں بلکہ بڑی پیٹ وانم باڑی ضلع شالی، ارکاٹ (تامل ناڈو) ہے۔[۲۰] اسی کو درست ماننا چاہیے۔

حجاب امتیاز علی کا انتقال ۱۸ر مارچ ۱۹۹۹ء کو ہوا۔[۲۱]

خدیجہ مستور

خدیجہ مستور اردو ناول اور افسانے کا ایک بڑا نام ہے۔ لیکن ان کی تاریخِ پیدائش اس کتاب میں بھی مکمل طور پر نہیں دی گئی جو ان پر لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں صرف سالِ پیدائش (۱۹۲۷ء) بغیر کسی حوالے کے لکھ دیا گیا ہے اور اسی کتاب میں ان کی جو تاریخِ وفات دی گئی (۲۸ر جولائی) وہ درست نہیں ہے۔[۲۲] بعض کتابوں میں ان کی تاریخِ پیدائش ۱۱ر دسمبر ۱۹۲۷ء دی گئی ہے لیکن اس میں ایک دن کا فرق ہے[۲۳] یعنی اسے ۱۲ر دسمبر ہونا چاہیے۔ بشارت علی خاں فروغ نے سال ۱۹۲۸ء لکھا ہے جو غلط ہے۔[۲۴]

'نقوش' (لاہور) کے شخصیات نمبر (جلد اول) میں خدیجہ مستور کی بہن ہاجرہ مسرور نے ایک مضمون 'خدیجہ مستور' کے عنوان سے لکھا جس میں خدیجہ مستور کی تاریخِ پیدائش ۱۲ر دسمبر ۱۹۲۷ء دی گئی ہے۔[۲۵] بہن ہونے کی بنا پر ان کی بیان کردہ تاریخ درست ہونے کا زیادہ امکان ہے اور اسے ہی درست مانا جائے گا۔ البتہ مزید تحقیق سے اس کے برخلاف شواہد دست یاب ہوں تو اور بات ہے۔

پروفیسر محمد اسلم نے خدیجہ مستور کی تاریخ وفات ۲۶ر جنوری ۱۹۸۲ء[۲۶] اور تاج بیگم فرخی نے ۲۸ر جولائی ۱۹۸۲ء لکھی ہے۔[۲۷] دونوں تاریخیں غلط ہیں۔ شاید کتابت کی غلطی ہے۔ خدیجہ مستور کا انتقال ۲۶ر جولائی ۱۹۸۲ء کو لندن میں ہوا اور لاہور میں تدفین کی گئی۔[۲۸]

عبداللہ خان خویشگی

پروفیسر محمد اسلم نے فرہنگِ عامرہ کے مولف محمد عبداللہ خان خویشگی کی تاریخ پیدائش ۱۱ر ربیع الاول ۱۳۱۵ ہجری اور تاریخِ وفات ۱۰ر ربیع الثانی ۱۳۸۰ ہجری لکھی ہے۔ اس تاریخ وفات کی مطابقت انھوں نے ۲ر اکتوبر ۱۹۶۰ء سے کی ہے۔[۲۹] سالِ پیدائش کی عیسوی تقویم سے تطبیق (۱۰ر اگست ۱۸۹۷ء) کے بعد ان تاریخوں کو بعض دیگر محققین مثلاً منیر احمد سلیچ[۳۰] اور عقیل عباس جعفری[۳۱] نے بھی درج کیا ہے۔ پیدائش کی تاریخ تو درست لکھی گئی ہے اور یہ حضرات تاریخ وفات کے معاملے میں بھی اپنی حد تک درست ہیں۔ لیکن تاریخِ وفات کی ہجری تاریخ ہی غلط ہو تو عیسوی تاریخ درست کیسے نکل سکتی ہے۔

خویشگی کی مذکورہ بالا تاریخِ وفات اس تاریخ سے جو اُن کی آخری آرام گاہ پر نصب کتبے میں درج ہے خاصی مختلف ہے۔ خدا جانے کمپوزر کی لاپروائی ہے یا پروفیسر اسلم صاحب سے سہو ہوا۔ خویشگی صاحب کے فرزند جناب ہدایت اللہ صاحب سے ایک اتفاقی ملاقات میں یہ ذکر آیا تو انھوں نے اپنے والد کی قبر کے کتبے کی تصویر راقم کو فراہم کی۔ اس سے تاریخ کی درستی ممکن ہوئی۔ اس کتبے کی عبارت من و عن پیش ہے:

۷۸۶

محمد عبداللہ خان خویشگی

مشفق، ناصح اور پیارے والد

پیدائش ۱۱/ربیع الاول ۱۳۱۵ھ خورجہ

وفات ۱۷/ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ کراچی

ولی اللہ، ثناء اللہ و ہدایت اللہ پسران

۱۱/ربیع الاول ۱۳۱۵ ہجری کی تطبیق ۱۰/اگست ۱۸۹۷ء سے ہوتی ہے۔[۳۲] گویا عبداللہ خویشگی کی تاریخِ پیدائش تو درست لکھی گئی ہے۔ البتہ تاریخ وفات یعنی ۱۷/ربیع الثانی ۱۳۸۷ ہجری کی مطابقت عیسوی تقویم سے کی جائے تو اسے ۲۵/جولائی ۱۹۶۷ء ہونا چاہیے۔[۳۳] یاد رہے کہ تقویم کی ان قمری تاریخوں میں رویتِ ہلال میں تقدیم و تاخیر کے سبب ایک دن کا فرق ہوسکتا ہے۔

ظفر عمر

بیگم حمیدہ اختر حسین رائے پوری کے والد ظفر عمر اردو کے معروف جاسوسی ناول نگار اور پولیس افسر تھے۔ ان کے ناول 'نیلی چھتری' کو بعض نقادوں نے اردو کا پہلا جاسوسی ناول بھی قرار دیا ہے اور کچھ کا خیال ہے کہ یہ طبع زاد نہیں تھا لہٰذا اسے اولین کہنا درست نہیں۔ بہر حال، اس بحث سے قطع نظر، ظفر عمر کی جو تاریخ ہائے پیدائش و وفات بعض مصادر میں ملتی ہیں وہ درست نہیں۔ اول تو بعض لکھنے والوں نے ان کا نام ظفر عمر زبیری (۲۰۰۷ء۔۱۹۲۵ء) سے خلط ملط کر دیا جو جاسوسی ناول نگار نہیں بلکہ ماہرِ تاریخ اور استاد تھے۔ دوسرے یہ کہ ظفر عمر کی تاریخوں کے ضمن میں صرف ۱۸۸۵ء اور ۱۹۴۹ء لکھا گیا۔[۳۴] حمیدہ اختر حسین رائے پوری نے اپنے والد کے بارے میں 'قومی زبان' میں لکھا تھا کہ ان کی پیدائش ۱۸۸۴ء کی ہے[۳۵] اور اُن کی تاریخِ وفات انھوں نے ۴/دسمبر ۱۹۴۹ء لکھی ہے۔[۳۶] لیکن ظفر عمر کی پیدائش کا سال ۱۸۸۵ء یا ۱۸۸۴ء درست نہیں ہے۔

پروفیسر محمد اسلم نے 'قومی زبان' میں شائع شدہ اپنے ایک مضمون میں بتایا ہے کہ ایک عمومی تاثر یہی ہے کہ ظفر عمر صاحب کا علی گڑھ ہی میں انتقال ہوگیا تھا لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ دراصل وہ قیامِ پاکستان کے بعد لاہور آگئے تھے اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔ پروفیسر اسلم نے لاہور کے میانی صاحب کے قبرستان میں ظفر عمر کی قبر بھی دریافت کی جس کے کتبے پر علی گڑھ یونی ورسٹی کا مخصوص نشان بھی تھا اور اس کتبے کے مطابق ظفر عمر ۲۷/اپریل ۱۸۸۳ء کو مظفر نگر میں پیدا ہوئے اور ۴/دسمبر ۱۹۴۹ء کو لاہور میں انتقال

کیا۔(۳۷) حمیدہ اختر صاحبہ نے بھی اپنے والد کی یہی تاریخِ وفات 'قومی زبان' میں مطبوعہ مذکورہ بالا مضمون میں بھی لکھی ہے۔ لہٰذا پروفیسر محمد اسلم صاحب کی لکھی گئی ان تاریخوں کو درست تسلیم کیا جانا چاہیے کیوں کہ یہ تاریخیں ظفر عمر کے اہلِ خانہ، غالباً ان کے صاحب زادوں، نے کتبے پر کندہ کرائی ہوں گی جو لاہور ہی میں ان کے ساتھ قیام پذیر تھے۔

نبی بخش بلوچ

نبی بخش بلوچ انگریزی، عربی، سندھی اور اردو میں لکھتے تھے۔ علامہ عبدالعزیز میمن کے شاگرد تھے۔ نبی بخش بلوچ کی تاریخِ پیدائش عام طور پر ۱۶/دسمبر ۱۹۱۷ء بتائی جاتی ہے۔(۳۸) یہ تاریخ اسکول کے رجسٹر میں اور بعدازاں دیگر اسناد میں بھی درج ہے لیکن اس زمانے میں اسکول میں داخلے کے وقت بچوں کی عمر زیادہ لکھوائی جاتی تھی تاکہ انھیں ملازمت جلد مل جائے۔(۳۹) خود نبی بخش بلوچ صاحب کے مطابق وہ مارچ ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔(۴۰) اس تاریخ کو درست تسلیم کیا جانا چاہیے۔ ہاں اس کے برعکس مستند شواہد دست یاب ہوں تو اور بات ہے۔

نبی بخش بلوچ کا انتقال ۶/اپریل ۲۰۱۱ء کو ہوا۔(۴۱)

حواشی

۱۔ ملاحظہ فرمایئے راقم کا مقالہ ''سوانحی لغات اور اہلِ قلم کی درست تاریخ ہائے پیدائش و وفات''، مشمولہ ''اخبارِ اردو'' (ادارۂ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد)، مشترکہ شمارہ مئی جون جولائی ۲۰۲۴ء؛ نیز یہی مقالہ بعدازاں انجمن ترقیِ اردو ہند (دہلی) کے ہفت روزے ''ہماری زبان'' کے دو شماروں (یکم اکتوبر ۲۰۲۴ء اور ۸/اکتوبر ۲۰۲۴ء) میں دو قسطوں میں شائع ہوا۔ دونوں رسالوں کے مذکورہ شمارے برخط (یعنی آن لائن) ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

۲۔ ''تذکرۂ ماہ و سال'' (دہلی: مکتبۂ جامعہ، ۱۹۹۱ء)، ص ۲۹۳۔

۳۔ ''وفیاتِ اہلِ قلم'' (اسلام آباد: اکادمی ادبیاتِ پاکستان، ۲۰۰۸ء)، ص ۳۰۔

۴۔ احمد حسین صدیقی، ''دبستانوں کا دبستان: کراچی''، حصۂ اول، (کراچی: محمد حسین اکیڈمی، ۲۰۰۳ء)، ص ۲۸۔

۵۔ منیر احمد سلیچ، ''بجھتے چلے جاتے ہیں چراغ''، (لاہور: قلم فاونڈیشن، ۲۰۱۸ء)، ص ۵۵۔

۶۔ ملاحظہ کیجیے راشد اشرف کی کتاب ''ابنِ صفی: شخصیت اور فن'' (کراچی: اٹلانٹس پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص ۱۹ (دوسرا ایڈیشن)؛ نیز محمد فیصل، ''ابنِ صفی: شخصیت اور فن''، (اسلام آباد: اکادمی ادبیاتِ پاکستان، ۲۰۱۷ء)، ص ۲۲، ۱۳، ۱۷۸۔

۷۔ راشد اشرف، ''ابنِ صفی: شخصیت اور فن''، محولۂ بالا، ص ۴۱؛ نیز محمد فیصل، ''ابنِ صفی: شخصیت اور فن''، محولۂ بالا، ص ۱۶۔

۸۔ دیکھیے: ''ارمغان'' (کراچی)، شمارہ ۳، اپریل تا جون ۱۹۹۶ء، ص ۶۔

۹۔ خاور جمیل (مرتب)، ''ڈاکٹر جمیل جالبی: بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا''، (کراچی: نیاز مندانِ کراچی، ۲۰۱۶ء)، ص ۱۷۔

۱۰۔ علی یاسر (مرتب)، ''اہلِ قلم ڈائریکٹری، ۲۰۱۰ء''، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۰ء)، ص ۸۷۔

۱۱۔ عبدالعزیز ساحر، ''ڈاکٹر جمیل جالبی: شخصیت اور فن''، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۷ء)، ص ۱۲۔

۱۲۔ عقیل عباس جعفری، ''پاکستان کرونیکل''، ضمیمہ، (کراچی: ورثہ، ۲۰۲۴ء)، ص ۱۳۱۶۔

۱۳۔ تفصیلات کے لیے: غفور شاہ قاسم، ''حجاب امتیاز علی تاج: شخصیت اور فن''، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۰ء)، ص ۱۵۔ ۱۴

۱۴۔ ''وفیاتِ اہلِ قلم''، محولہ بالا، ص ۱۳۴۔

۱۵۔ منیر احمد سلیچ، ''بجھتے چلے جاتے ہیں چراغ''، محولہ بالا، ص ۱۵۲۔

۱۶۔ ''اردو افسانے کی روایت'' (اسلام آباد: اکادمی ادبیاتِ پاکستان، ۱۹۹۱ء)، ص ۴۵۹۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۴۶۲۔

۱۸۔ ''اردو افسانے کی روایت''، (دہلی: عالمی میڈیا، ۲۰۱۴ء)، ص ۵۷۵۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۵۷۸۔

۲۰۔ غفور شاہ قاسم، ''حجاب امتیاز علی تاج: شخصیت اور فن''، ص ۱۷۔۱۴، ۴۴۔

۲۱۔ منیر احمد سلیچ، ''بجھتے چلے جاتے ہیں چراغ''، محولہ بالا، ص ۱۷۲۔

۲۲۔ تاج بیگم فرخی، ''خدیجہ مستور: شخصیت اور فن''، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۰ء)، ص ۱۴، ۳۶۔

۲۳۔ مثلاً: منیر احمد سلیچ، ''وفیاتِ مشاہیر لاہور''، (لاہور: قلم فاونڈیشن، ۲۰۱۸ء)، ص ۱۶۵؛ نیز عقیل عباس جعفری، ''پاکستان کرونیکل''، (کراچی: ورثہ، ۲۰۱۰ء)، ص ۵۳۰۔

۲۴۔ ''وفیاتِ مشاہیر اردو''، (دہلی: ناشر مصنف، ۲۰۰۰ء)، ص ۲۳۴۔

۲۵۔ دیکھیے: ہاجرہ مسرور کا مضمون بعنوان ''خدیجہ مستور''، مشمولہ ''نقوش'' (لاہور)، ''شخصیات نمبر''، جلد اوّل، جنوری ۱۹۵۵ء، ص ۴۴۲۔

۲۶۔ ''خفتگانِ خاکِ لاہور''، (لاہور: ادارۂ تحقیقاتِ پاکستان، ۱۹۹۳ء)، ص ۳۲۷۔

۲۷۔ ''خدیجہ مستور: شخصیت اور فن''، محولہ بالا، ص ۳۶۔

۲۸۔ منیر احمد سلیچ، بجھتے چلے جاتے ہیں چراغ، محولہ بالا، ص ۱۷۲۔

۲۹۔ خفتگانِ کراچی (لاہور: ادارۂ تحقیقاتِ پاکستان، ۱۹۹۱ء)، ص ۱۴۸۔

۳۰۔ وفیاتِ مشاہیر کراچی (کراچی: قرطاس، ۲۰۱۶ء)، ص ۲۰۵۔

۳۱۔ پاکستان کرونیکل، محولہ بالا، ص ۱۸۰۔

۳۲۔ ملاحظہ ہو ضیاء الدین لاہوری کی مرتبہ جوہر تقویم (لاہور: جمعیت پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء)، ص ۲۲۷۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۲۳۷۔

۳۴۔ دیکھیے: منیر احمد سلیچ، وفیاتِ مشاہیر کراچی، محولہ بالا، ص ۱۸۹؛ نیز منیر احمد سلیچ، بجھتے چلے جاتے ہیں چراغ، محولہ بالا، ص ۲۶۳۔۲۶۲

۳۵۔ دیکھیے حمیدہ اختر حسین رائے پوری کا مضمون نیلی چھتری، مشمولہ قومی زبان (انجمن ترقی اردو، کراچی)، جون ۱۹۹۴ء، ص ۳۶۔

۳۶۔ ایضاً، ص ۴۸۔

۳۷۔ دیکھیے پروفیسر محمد اسلم کا مضمون بعنوان کچھ ظفر عمر کے بارے میں، مشمولہ قومی زبان (کراچی)، اکتوبر، ۱۹۹۴ء، ص ۲۹۔۲۸

۳۸۔ مثلاً: منیر احمد سلیچ، بجھتے چلے جاتے ہیں چراغ، محولہ بالا، ص ۴۱۸۔

۳۹۔ محمد راشد شیخ، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ: شخصیت اور فن (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۷ء)، ص ۲۴۔

۴۰۔ ایضاً۔

۴۱۔ منیر احمد سلیچ، بجھتے چلے جاتے ہیں چراغ، محولہ بالا، ص ۴۱۸۔

ڈاکٹر سیّد وسیم الدین ٭

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C. Latifabad, Hyderabad.

نواب بہادر یار جنگ بحیثیت شاعر

شاعری دراصل فکر اور جذبے کے اظہار کا نام ہے۔ ایک شاعر جب شعر کہتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ سکوت وسکون سے ماورا ہو کر اور بے عملی اور بے اعتنائی سے دور ہو کر ایک خدمت انجام دیتا ہے۔ اس خدمت کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں بڑا وہ ہے جس کی آواز بنی نوع انسان تک پہنچ جائے۔ لسان الامت یقیناً اس لیے ایک عظیم انسان تھے کہ وہ اپنی آواز کو دوسروں تک پہنچانے کا سلیقہ اور اہتمام کرتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی شعلہ بیانی سے اپنی خطابت کے جوہر دکھلائے اور شعر کو اپنا وسیلۂ اظہار بنانے کی سعی بھی کی۔ وہ خود میں چھپے ہوئے شاعر کو پیش کرنے کا اوائل عمری ہی سے جذبہ رکھتے تھے لیکن اس جذبے کو تحریک دینے کے لیے اُنھیں سازگار عوامل مہیا نہ ہو سکے۔ خُلقؔ اُن کا تخلص تھا۔ اُنھوں نے حمدِ باری تعالیٰ، نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، نظم، غزلیات، رباعی اور قطعات کہے ہیں لیکن سیاسی مصروفیات کی وجہ سے فنِ شاعری پر اُن کی توجہ کم رہی۔ بہادر یار جنگ معروف شاعر تو نہیں تھے مگر اُن کے جذبے کی صداقت، اُن کی شاعری میں جا بجا دکھائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر طاہرہ نیّر نے اپنے تحقیقی مقالے میں لکھا ہے کہ:

> تحریکِ پاکستان نے اردو شاعری میں اسلوب و ہیئت کے اعتبار سے مستقل تبدیلی تو نہیں کی مگر مسلم عوام کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس جدوجہد میں غالب حصہ اُن شعرا کا بھی ہے جو بہت زیادہ نامور تو نہیں تھے مگر اُن کے جذبے کی صداقت اور خلوص کی سچائی شاعری کے ہر مسلمہ اعتبار سے برتر تھی۔

نواب بہادر یار جنگ کے سنِ ولادت ۱۹۰۵ء اور اُن کی وفات ۱۹۴۴ء تک کا زمانہ دکن ہی نہیں بلکہ سارے ہندوستان میں معاشی وسماجی طور سے عجیب طرح کی بے فکری اور آسودگی کا دور تھا۔ اُسی کے شانہ بشانہ تحریکِ آزادی بھی رواں دواں تھی۔ اردو نثر و نظم میں بھی یہ دونوں عناصر ساتھ ساتھ کارفرما تھے۔ علی گڑھ تحریک کے بعد فکر و مشاہدہ اردو ادب کا ایک اہم وصف بن چکا تھا۔ لیکن اُس کے ساتھ ساتھ کچھ رنگ رلیاں منانے کا انداز بھی ہماری شاعری کے دامن سے چمٹا رہا۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۴۴ء تک کے اس دور پر حسرتؔ موہانی (۱۸۷۸ء۔ ۱۹۵۱ء)، جوشؔ ملیح آبادی (۱۸۹۸ء۔ ۱۹۸۲ء)، حفیظؔ جالندھری (۱۹۰۰ء۔ ۱۹۸۴ء) اور اخترؔ شیرانی (۱۹۰۵ء۔ ۱۹۴۸ء) کے ساتھ ساتھ قدآور شعری شخصیت (۱۸۷۷ء۔ ۱۹۳۸ء) کا اثر بھی ہر طرف نظر آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ادب

٭ صدر، بہادر یار جنگ اکادمی، بہادر آباد، کراچی۔ رابطہ: ۰۳۳۲۔۲۵۳۸۱۷۹

کے فروغ اور شاعری کی مقبولیت سے جو علمی ماحول پیدا ہوا، وہاں بہادر یار جنگ جیسی شخصیت کے جنم لینے کے امکانات واضح اور روشن ہوتے ہیں۔ چناں چہ وہ اُسی ماحول کی پیداوار تھے۔ شاعری دراصل بہادر یار جنگ کے لیے اضافی حیثیت رکھتی تھی جیسا کہ اکثر وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ:

> میں بلاارادہ اس جذبے کو دباتا ہوں کیوں کہ شاعر بالعموم عمل سے دور رہتے ہیں اور مجھے کچھ کام کرنا ہے۔

بہادر یار جنگ ادب و شاعری کے معاملے میں پوری طرح باخبر تھے۔ وہ ادب کے محاسن خاص طور پر شاعری کی ذمے داریوں اور ضرورتوں سے مکمل طور پر واقف تھے۔ چناں چہ اس حوالے سے اُن کا کہنا تھا کہ:

> شاعری اُس جادو کا نام ہے جو زبانِ شاعر سے نکل کر قلوبِ انسانی کو مسخر کرتا ہے تو ایسے جادوگر ہر قوم میں ضرور پیدا ہوئے لیکن ایک دو سے زیادہ نہیں۔

بہادر یار جنگ کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ اس دنیا میں جتنے بھی انقلاب آئے وہ صرف تلوار کی بدولت نہیں بلکہ خطیب کی زبان، مدبر کے دماغ اور شاعر کے قلم کے بھی رہینِ منّت ہیں۔ اُن کے نزدیک ایک بڑا شاعر ہی لفظ کو نیا مزاج عطا کرتا ہے۔ یہ مزاج اپنے زمانے کے مزاج اور اپنے سماجی حالات وخصوصیات سے اپنی تعمیر کرتا ہے۔ یہی لفظ بدل کر جب زبان کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو پھر وہ سماجی وقومی ارتقا میں اپنا کردار ادا کرتے رہتے ہیں۔

بہادر یار جنگ کی شاعری کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُن کے کلام میں حسبِ ذیل اصناف قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ نظمیں جو مختلف موضوعات پر ہیں۔ یہ تعداد ۱۲ ہیں۔

۲۔ رباعیات وقطعات۔

۳۔ بکھرے موتی

۴۔ اشعارِ غزل

بہادر یار جنگ خُلق کی اہمیت دوطرح کی تھیں۔ وہ سخن فہم بھی تھے اور سخن سنج بھی۔ ایک شاعر کی حیثیت سے اُنھوں نے خود بلند مقام حاصل کرنے کی سعی نہیں کی البتہ شاعری کو جذب کرنے کی اور اُس کی لطافتوں سے خود کی زندگی اور خاص کر اپنے ماحول کو خوش گوار بنانے کے لیے جو شعوری کوشش کی، وہ ایک ایسا عمل ہے کہ تحقیق کے طالبِ علم کے سامنے کئی دریچے اور دروازے کھول دیے ہیں۔ وہ درسِ قرآن کی محفلوں میں اللہ کے خادم کے روپ میں اپنا فرض انجام دیتے ہیں جہاں ایک خوش گوار کیفیت سامعین پر طاری ہوجاتی، وہاں قرآن کا تقدس اردو ادب وسفر کے وسیلے سے سامعین کی روح کو تڑپاتا اور روحانی سکون وسُرور کا باعث بن جاتا۔ کچھ یہی منظر ''درسِ اقبال'' کی محفلوں میں بھی نظر آتا تھا۔ شاعر کو سمجھانے کے لیے ایک مجسم شعر کا لب کشائی کرنا ایک حسین عمل ہوا کرتا ہے۔ اس لیے درسِ اقبال کی محفلیں شعر کی رعنائیوں اور لطافتوں کے ساتھ ساتھ فکر کی گہرائیوں کو بھی اپنا لیتی تھیں۔

محمد بہادر خان خلق ایک صاحبِ دل مسلمان تھے۔ وہ اپنے رب سے مخاطب ہونے میں جو لذت محسوس کرتے تھے یا بارگاہِ

رسالت مآب ﷺ میں نذرانہ عقیدت پیش کرنے میں جو سکون محسوس کرتے تھے، وہ روایتی عشقیہ کلام میں اُنھیں نہیں ملتا تھا۔ خلق کے نزدیک باری تعالیٰ کی یاد اور اُن کے محبوب کشورِ رسالت ﷺ کی رفعتِ شان کا ذکرِ خیر یاد کرنے والے کے مقامات کو بلند کرتا ہے۔ اپنی ایک خوب صورت اور عمدہ نعت کے ذریعے وہ دانائے سبل اور مولائے کُل کو یوں خراجِ عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں کہ:

اے کہ تیرے وجود پر خالقِ دو جہاں کو ناز — اے کہ تیرا وجود ہے وجہِ وجودِ کائنات
اے کہ ترا سرِ نیاز حدِ کمالِ بندگی — اے کہ تیرا مقامِ عشق قربِ تمام عینِ ذات
اے کہ تری زبان سے ربِ قدیر گل فشاں — وحیِ خدائے لم یزل تری ایک ایک بات
اے کہ فخرِ آدمی، واقفِ سرِ عالمیں — لوح و قلم سے بے نیاز تیرے علومِ شش جہات
خوگرِ بندگی جو تھے تیرے طفیل میں ہوئے — مالک مصر و کاشغر وارثِ دجلہ و فرات
مجھ سے بیاں ہو کس طرح رفعتِ شانِ احمدی ﷺ — تنگ میرے تصورات پست میرے تخیلات

بہادر یار جنگ خُلق کی یہ برملا رباعی ملاحظہ فرمائیے کہ:

دولت کو آنی جانی سمجھو — عزت کو خدا کی ایک نشانی سمجھو
اتراؤ نہ اپنی خوش بیانی پر خُلق — اس کو بھی خدا کی خوش بیانی سمجھو

بہادر یار جنگ کو جب سیاست کے میدان سے علیحدہ رکھنے کے لیے ایک سیاسی چال کے تحت انگریزوں کی ایما پر ریاستِ حیدر آباد کے آخری بادشاہ نواب میر عثمان علی خاں نے ۱۹۴۳ء میں یہ فرمان جاری کیا کہ جاگیردار طبقے کا کوئی فرد سیاست میں حصہ نہیں لے سکتا تو اُنھوں نے اپنی جاگیر اور خطاب والیِ ریاست کو واپس لوٹا دیا۔ جب اُن سے اس کی وجہ دریافت کی تو اُنھوں نے یہ منظوم جواب دیا کہ:

آ گئے تھے برق کی زد میں تمام اہلِ چمن
ہم نے اپنے آشیانے کو مقابل کر دیا

بہادر یار جنگ کے قطعات میں افسردگی، مایوسی اور بے دلی نہیں بلکہ حوصلہ اور اُمنگ جیسے احساسات نمایاں ملتے ہیں۔ اُن کا یہ قطعہ نذرِ قارئین ہے کہ:

کیوں اپنا قفس دیکھ کے ناشاد ہے تُو — مایوس جو ہو گیا تو برباد ہے تُو
گر دل تیرا آزاد ہے اے صیدِ قفس — آزاد ہے، آزاد ہے، آزاد ہے تُو

نواب بہادر یار جنگ کی غزلیات کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے کہ:

یہ کیسی بے خودی چھائی ہوئی ہے سارے عالم پر — میں اُن کو پوچھتا ہوں وہ تیرا رستہ بتاتے ہیں

یوں تو ہنگامِ خزاں میں ہی پریشان ہوا پر تیری یاد بنی باغِ تصور کی بہار

یار کی خاطر مجھے رسوائی بھی منظور ہے اک ذرا وہ مسکرا تو دیں لبِ بام آ کے آج

یخ بستہ ہو گئے ہیں حریفانِ تنگ دل دیکھیں جو مجھ سے آپ کی یہ کرم جوشیاں

یار کی دل نوازیوں کو دیکھ بھول جا بے قراریاں اے دل

نامِ خدا ابھی تو ہوئے ہیں جوان وہ اب اہلِ دل دلوں کی حفاظت کیا کریں

یاد کے شعروں نے کردیا ہے تنگ آج ہے خوب عقل و فکر کی جنگ

یار کی تصویر کھینچی جائے گی یعنی ممکن ہوگا اب امرِ محال

یہ رباعی بھی ملاحظہ فرمائیے کہ یہ قابلِ ذکر ہے جو خُلقؔ نے دسمبر ۱۹۴۳ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کراچی میں اختتامِ تقریر کرکے واپسی پر کہی تھی جس میں اُنھوں نے اپنی اعلیٰ خطابت پر ناز فرمایا تھا اور سحرالبیان خطیب ہونے کی حقیقت کا اظہار کچھ اس طرح کیا تھا کہ:

آگاہ رموزِ دینِ فطرت ہوں میں کچھ مجھ سے سنو لسانِ اُمت ہوں میں
میں خطبہ سرا نہیں تو سُونی ہے بزم شہنشاہِ اقلیمِ خطابت ہوں میں

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بہادر یار جنگ اپنی قومی اور ملّی مصروفیات کے باعث شاعری کے کوچے میں دور تک گامزن نہیں رہے لیکن اس کے باوجود اُنھوں نے تحریکِ پاکستان میں جو ناقابلِ فراموش خدمت انجام دیں، اُس میں بھی اپنی ولولہ انگیز خطابت کے دوران اپنی شاعری کا برمحل استعمال کیا۔ اُنھوں نے سرسیّد احمد خاں (۱۸۹۸ء۔ ۱۸۱۷ء) کی طرح اپنے اظہارِ خیال کے لیے نثر کو وسیلہ بنایا اور قوتِ گویائی کو اپنے کمال کا مینارۂ نور سمجھا۔ اُن کا مختصر کلام دستیاب ہوا ہے اور بعض کاغذات میں صرف چند مصرعے اور ادھوری غزلیں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ اس بکھرے ہوئے شعری سرمائے سے جب استفادہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو مجموعی طور پر ہم یہ تاثر قبول کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ محمد بہادر خان خُلقؔ ایک صاحبِ دل مسلمان تھے۔ نذیر الدین احمد نے ''بہادر یار جنگ کا غیر مطبوعہ کلام'' کے نام سے ترتیب دیا ہے۔ شعروشاعری سے اُن کی غیر معمولی دل چسپی کا یہ عالم تھا کہ متقدین اور دورِ حاضر کے شعرا کے ہزاروں اردو فارسی اور عربی اشعار نوکِ زبان پر تھے۔ فنِ شاعری میں اُنھیں وحید العصر علامہ نجم الدین المعیؔ کی

شاگردی کا شرف حاصل رہا۔ علامہ المعیؔ صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ''ذکرِ خیر'' کے نام سے اُن کا مذہبی کلام شائع ہو چکا ہے۔

ہر چند بہادر یار جنگ خُلقؔ کا جو مختصر کلام ہمیں دستیاب ہوا ہے اُس کے مطلعے سے نہ صرف بہادر یار جنگ کی شعری صلاحیتیں اور فکری مقامات ہمارے سامنے آتے ہیں، وہیں پر ہمیں اُس دور کے میلانِ طبع اور اندازِ نگارش کا حال بھی معلوم ہوتا ہے۔ اُن کی شاعرانہ خصوصیات کے بارے میں عشق و مستی کے شاعر جگرؔ مرادآبادی (۱۸۹۰ء۔ ۱۹۶۰ء) نے بہادر یار جنگ کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے کہ:

> میں اپنے مجموعۂ کلام (آتشِ گُل) کو قائدِ ملت بہادر خاں مرحوم سابق نواب بہادر یار جنگ کے نام سے منسوب کرنا اپنا اخلاقی و ادبی فرض تصور کرتا ہوں جو سراپا گداز، مجسمِ اخلاق، فقید المثال مقرر، کامیاب مصلح، اپنے وقت کے عظیم المرتبت خطیب اور ایک جری انسان تھے جن کے گفتار و کردار میں کوئی تضاد نہ تھا۔ وہ بہ یک وقت تمام محاسنِ شعری کا احاطہ کر لیتے تھے اور اچھے شعر سے اتنی شدت کے ساتھ متاثر ہوتے تھے کہ میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسا کوئی دوسرا خوش مزاج نہیں دیکھا۔

جبران خلیل جبران کی معرکہ آرا تصنیف The Prophet کے قاضی عبدالغفار کے اردو ترجے

''اُس نے کہا''

کا

تنقیدی و تحقیقی مقالہ



مقالہ کار: ڈاکٹر احمد محمد احمد عبدالرحمٰن القاضی

پیش لفظ و تعارف: السیّد عابد رضوی

قیمت: ۷۰۰ روپے

انجمن ترقیِ اردو پاکستان، ایس ٹی ۱۰، بلاک ۱، گلستانِ جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی

ڈاکٹر رؤف خیر ٭

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C, Latifabad, Hyderabad.

ماہرِ لسانیات و زبان و بیان: پروفیسر غازی علم الدین

اگر شہید نہیں ہے تو پھر تو غازی ہے
وہ کارزار سے ناکام کیسے نکلے گا

پروفیسر غازی علم الدین ہندوپاک میں لسانیات کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ وہ اردو کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی، انگریزی سے کماحقہٗ واقف تھے۔ وہ نہ صرف عربی میں ایم اے تھے فارسی میں بھی ایم اے کیا۔ انگریزی بھی اچھی تھی۔ پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں کامیابی کی بنیاد پر لکچرر بن گئے اور پرنسپل کے عہدے سے سبک دوش ہوئے۔

غازی علم الدین کا کمال یہ ہے کہ پاکستان کا ہر قدآور قلم کار غازی صاحب کی علمیت کا قائل اور غازی صاحب ہر ادیب سے رابطہ استوار رکھتے تھے۔ آپ کی نفاست پسندی اور معیار کا یہ عالم تھا کہ آپ کی کتابیں بہترین کاغذ بلکہ آرٹ پیپر پر پاکستان کے باوقار پبلشر کے زیرِ اہتمام شائع ہوتی تھیں۔ جیسے آپ کی معرکہ آرا بے مثال کتاب ''لسانی مطالعے'' مقتدرہ قومی زبان جیسے ادارے کے ذریعے مثال پبلشرز فیصل آباد نے ۲۰۱۲ء میں شائع کی۔ اس کے علاوہ مجلہ ''سیماب'' (آرٹ پیپر پر) ۲۰۱۵ء میں ''اہلِ قلم کے مکاتیب بنام غازی علم الدین'' ۲۰۱۶ء میں، ''مشاہیر ادب کے خطوط بنام غازی علم الدین'' بلحاظ ترتیب زمانی ۲۰۱۹ء میں ''تخلیقی زاویے'' (ادبی و شخصی مطالعے) ۲۰۱۷ء میں اسی مثال پبلشرز فیصل آباد کے زیرِ اہتمام شائع ہوئے۔ ادب کے علاوہ موصوف کو سیاسیات Political Science سے بھی دل چسپی تھی چناں چہ پروفیسر غازی علم الدین کے ایم فل کا مقالہ ''میثاقِ عُمرانی'' (فارابی، ابنِ خلدون اور شاہ ولی اللہ کے عمرانی نظریات کا تجزیہ) ۲۰۰۹ء میں منظرِ عام پر آیا جس کا دوسرا ایڈیشن مکتبۂ جمال، لاہور نے ۲۰۱۲ء میں شائع کیا۔ مغربی مفکرین تھامس ہابس، جان لاک اور روسو کے Social Contact پر بھی غازی صاحب نے سیر حاصل گفتگو کی اور ان پر فارابی، ارسطو، ابنِ خلدون اور شاہ ولی اللہ کے عمرانی نظریات کو فوقیت دی۔ غازی علم الدین کی ایک ایک کتاب کا سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔

میرپور خاص پاکستان میں غازی علم الدین نے پرنسپل کی حیثیت سے ڈگری کالج کی ترقی میں نمایاں خدمات انجام دیں اور اس کا نمائندہ مجلہ ''سیماب'' آرٹ پیپر پر ۲۰۱۵ء میں شائع کیا جس میں سارے پاکستان کی قدآور شخصیات کی تخلیقاتِ نظم و نثر شامل کر کے اسے دستاویزی حیثیت بخشی۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ محترم غازی علم الدین مجھ خاکسار رؤف خیرؔ پر بہت مہربان تھے۔ وہ اپنی

٭ موتی محل، گولکنڈہ، حیدرآباد دکن، ہندوستان۔ raoofkhair@gmail.com

بیشتر کتابوں میں ناچیز کا ذکر خیر فرمایا کرتے تھے میں نے بھی اپنی ایک کتاب ''مشاہیر خطوط کے حوالے سے'' مطبوعہ ۲۰۱۵ء پروفیسر غازی علم الدین کے نام معنون کی تھی۔ مجلّہ ''سیماب'' میں غازی علم الدین صاحب نے میری ایک حمد، ایک نعت اور دو غزلیں شائع فرمائیں۔ اس کے علاوہ میری شعری کلیات ''خیریات'' پر پاکستان کے ایک صاحب نظر نقاد جاوید الرحمٰن قریشی صاحب سے جامع تبصرہ بھی کروا کر شائع فرمایا تھا۔ اردو شعر و ادب پر مشتمل چار سو بیس صفحات اور انگریزی ادب پر مشتمل چالیس صفحات پر مبنی یہ ضخیم مجلہ مجھے عنایت فرمایا۔ درمیان کچھ پنجابی تخلیقات بھی سیماب میں شامل کی گئی ہیں۔

اس کے علاوہ ان کی ضخیم کتابیں ''اہلِ قلم کے مکاتیب بہ نام غازی علم الدین'' مطبوعہ ۲۰۱۶ء، ''تخلیقی زاویے'' (ادبی و شخصی مطالعے) مطبوعہ ۲۰۱۷ء اور ''مشاہیر ادب کے خطوط بنام غازی علم الدین'' (مرتبہ حفیظ الرحمٰن احسن) مطبوعہ ۲۰۱۹ء سے بھی مجھے سرفراز فرمایا۔ ان کی اہم دستاویزی نوعیت کی کتابوں کے علاوہ بھی غازی علم الدین نے مزید کرم فرمایا کہ علامہ اقبال کے فرزندِ ارجمند جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کی معرکہ آرا نایاب خودنوشت ''اپنا گریباں چاک'' اور جی سی یونی ورسٹی لاہور کا ''تحقیق نامہ ۰۶۔۲۰۰۵ء'' بھی مجھے بھجوایا جن کے حوالے سے میں نے بعض ہنگامہ خیز مضامین لکھے جو ہندو پاک کے معیاری رسائل میں شائع بھی ہوئے اور جو میری کتابوں میں بھی شامل ہیں۔ سیف اللہ خالد جیسے بے باک جری قلم کار کی قدرت اللہ شہاب پہ لکھی گئی کتاب ''شہاب بے نقاب'' بھی عنایت فرمائی۔ انھوں نے اپنے بیٹے خبیب غازی کی شادی کی خوش خبری سنائی اور جب ان کے ہاں پوتی پیدا ہوئی تو اس کی نوید بھی سنائی تھی۔ فون پر گاہے گاہے گفتگو ہوا کرتی تھی۔ وہ فروری ۲۰۱۴ء میں ایک حادثے کا شکار ہوئے تھے پھر الحمد اللہ صحت یاب ہو گئے تھے مگر اس کے بعد انھوں نے بری خبر سنائی کہ وہ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہیں جس کے علاج کے لیے ساڑھے تین تین لاکھ روپے فی عدد کے چار انجکشن جرمنی سے منگوائے گئے ہیں۔ علاج جاری تھا۔ کچھ دن وہ عمران خان کے قائم کردہ شوکت خانم ہسپتال میں بھی زیرِ علاج رہے۔ مگر آخر کار وقتِ موعود آ ہی پہنچا اور وہ آٹھ اپریل ۲۰۲۵ء رات دیر گئے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ان کا گزر جانا میرا بہت بڑا ذاتی نقصان ہے۔ دریائے ستلج کے قریب برج کلاں ضلع قصور، پاکستان میں یکم جنوری ۱۹۵۹ء کو ایک کاشت کار خاندان میں پیدا ہونے والے غازی علم الدین نے بمشکل چھیاسٹھ برس کی عمر پائی تھی۔

ایک سوا کانوے ۱۹۱ مشاہیر کے مکاتیب کے ساتھ ساتھ خاکسار رؤف خیر کے چند خطوط بھی اس مجموعۂ مکاتیب میں شامل ہیں جو خاکسار کے لیے باعثِ عزو شرف ہے۔ مشاہیر نے اپنے خطوط میں پروفیسر غازی علم الدین کی ادبی خدمات کی دل کھول کر پذیرائی کی۔ البتہ شمس الرحمٰن فاروقی نے غازی صاحب کے ''لسانی مطالعے'' کے بعض مباحث سے اختلاف کیا اور ایک طویل خط لکھا تھا جسے نہایت اعلیٰ ظرفی و فراخ دلی سے غازی صاحب نے مکاتیب کے مجموعے میں شامل رکھا تا کہ اہلِ نظر خود ملاحظہ فرمالیں کہ شمس الرحمٰن فاروقی کا موقف کہاں تک حق بجانب ہے جیسے فاروقی کا خیال ہے کہ ''زبان رواجِ عام سے بنتی ہے اور جو کچھ بھی زبان میں رائج ہے وہی درست ہے'' ناچیز رؤف خیر کا خیال ہے کہ پروفیسر غازی علم الدین کا جہاد اسی رواج عام کے خلاف ہے جو زبان کو بگاڑنے کے درپے ہے۔ بازاروں کے علاوہ ذمے دار اداروں جیسے ریڈیو ٹیلی ویژن اور اخباروں میں بھی غلط زبان رواج پا رہی ہے اس کے خلاف

احتجاج ضروری ہے تا کہ زبان کی ادبیت اور اس کی اصلیت مجروح نہ ہو۔

اسی سلسلے کا ایک اور اہم مجموعہ، (لسانی مباحث، شخصی مطالعات، علمی و ادبی موضوعات پر مبنی) ''مشاہیرِ ادب کے خطوط بنام غازی علم الدین'' (بلحاظِ ترتیب زمانی) رسالہ ''سیارہ'' لاہور کے مدیر جناب حفیظ الرحمٰن احسن نے ترتیب دیا، جسے حسبِ معمول مثال پبلشرز فیصل آباد پاکستان نے ۲۰۱۹ء میں مثالی اہتمام سے شائع فرمایا۔ وہ تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ کووڈ ناگہانی عذاب کے نازل ہونے سے پہلے یہ گراں قدر مجموعہ ہندو پاک کے قدآور اہلِ علم کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔ اس کا پیش گفتار مرتب محترم حفیظ الرحمٰن احسن نے، پیش لفظ بے نظیر محقق و نقاد محترم حافظ محمود شیرانی کے پوتے اور معنوی جانشین پروفیسر مظہر محمود شیرانی نے، مقدمہ پروفیسر عبدالستار دلوی اور حرفے چند ڈاکٹر رؤف پاریکھ جیسے ماہر زبان و ادب نے لکھا۔ چار سو بیانوے ۴۹۲ صفحات پر پھیلے ہوئے مشاہیر کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ غازی علم الدین کیسے کیسے قدآوروں میں مقبول ہیں اور اپنی علمی کاوشوں کی داد کیسے کیسے صاحب نظر نقادوں سے پاتے ہیں۔ ۲۰۰۳ء سے ۲۰۱۸ء کے پندرہ سالہ دورانیے میں اکیاسی ۸۱ اربابِ نظر نے غازی علم الدین کی مختلف کتابوں کی تحریری داد دی جو سند کا درجہ رکھتی ہے۔ تاریخی اعتبار سے ترتیب دیا ہوا یہ مجموعہ مکاتیب تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر یونس جاوید، سردار عتیق احمد خان، ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ڈاکٹر سعادت سعید، ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر اسلم انصاری، ڈاکٹر معین الدین عقیل، بریگیڈیئر حامد سعید اختر، پروفیسر خیال آفاقی، ڈاکٹر غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر، محترمہ یاسمین گل، ڈاکٹر غلام شبیر رانا، ڈاکٹر خورشید رضوی، جناب نسیم سحر، ڈاکٹر ایوب صابر، ڈاکٹر معین الدین جینا بڑے اور محترم ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور خاکسار رؤف خیر کے خطوط اس میں شامل ہیں۔ ہر خط سے ایک دو جملے بھی لیے جائیں تو مضمون کافی طویل ہو جائے گا۔ محترم رفیع الدین ہاشمی نے اپنے خط میں غازی صاحب سے فرمایا:

> بہر حال صحتِ زبان و املا کے بارے میں آپ نے جو جہاد شروع کر رکھا ہے، اسے جاری رہنا چاہیے۔ بڑا مبارک قومی فریضہ ہے۔ اللہ آپ کو بیش از پیش توفیق بخشے۔ آمین

محترم شاہد علی خان صاحب اپنے ہر دل عزیز رسالے ماہ نامہ ''الحمرا'' کا ہر سال جنوری میں ضخیم سال نامہ نکالتے ہیں۔ یہ ان کی عنایتِ بے نہایت ہے کہ جنوری ۲۰۱۹ء کے سالنامے میں مدیر محترم نے رؤف خیر کا گوشہ بھی نکالا جس میں ناچیز کے تین مضامین، چند غزلیں اور ناچیز کے فکروفن پر دو مضامین بھی شامل تھے۔ ہر سال الحمرا کے سالنامے کے اجرا کی شاندار تقریب کسی نہ کسی اچھی ہوٹل میں منائی جاتی ہے اور منتخب اکابرین کو مدعو کیا جاتا ہے۔ ۲۰۱۶ء یا ۲۰۱۷ء کے الحمرا کے سالنامے کی بے مثال تقریب نے خاص طور پر پروفیسر غازی علم الدین صاحب کو لاہور مدعو کیا گیا تھا جس کی غازی صاحب نے رپورتاژ بھی قلم بند کی تھی۔

بے لوث و بے غرض خطوط کے ساتھ ساتھ کچھ لوگوں نے اُن سے مالی مطالبات بھی کیے۔ جیسے انڈیا کے شہر پونے کے ایک رسالے کے مدیر اپنے ایک خط مورخہ ۲۰/جون ۲۰۱۶ء میں غازی صاحب سے ملتمس ہیں:

> میری توشیحات والی کتاب اگر آپ دلی سے شائع کرا دیں تو ایک یادگار کام ہو سکتا ہے۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی والوں سے آپ کے مراسم ہیں۔ ۱۴۴ صفحات کی کتاب ہو سکتی ہے۔ عید مبارک

اس سے پہلے ایک خط ۲۶/دسمبر ۲۰۱۵ء میں وہ غازی صاحب کو لکھتے ہیں:

''اگرچہ گزشتہ دنوں'' (رسالے) کے لیے مالی تعاون ارسال کرنے میں آپ کو ذرا سی دقت پیش آئی تھی۔ ممکن ہے یہ دقت آئندہ بھی پیش آئے لیکن ادب کا کام ہر حال میں کرنا ہی ہے۔''

امریکا، کینیڈا، لندن وغیرہ مغربی ممالک میں رہنے والے شعرا و شاعرات و افسانہ نگاروں کے گوشے مدیر موصوف اپنے رسالے کے ذریعے نکالتے رہے ہیں۔ مغربی ممالک کے متمول قلم کاروں کے لیے ڈالرز میں ان کی مدد کرنے میں بھلا کیا تامل و تکلف ہو سکتا ہے۔ یوں بھی ماہ نامہ ''شاعر'' نے اس قسم کے گوشوں کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس کی اتباع میں موصوف نے بھی کئی گوشے نکالے جو ان کی آمدنی کا ذریعہ ثابت ہوئے۔ مدیر موصوف دیگر رسائل کے مدیروں سے بارٹر سسٹم پر معاملت کر کے ان کے رسالوں میں اپنے گوشے اور اپنے رسالے میں ان کے گوشے شائع کیے۔ یہ لین دین تو یونی ورسٹی کے اساتذہ میں بھی مروج ہے۔

پاکستان میں رہنے والے غازی علم الدین سے اپنی توشیحات کی کتاب انڈیا میں شائع کروانے کے لیے مالی تعاون کا طلب گار ہونا حیرت میں ڈالتا تو ہے مگر ستم عجب یہ کہ بہار کے ایک عاشق ادب کو پروفیسر غازی علم الدین کی شاہ کار کتاب ''لسانی مطالعے'' اتنی پسند آئی کہ اسے لفظ بہ لفظ اپنے نام سے انڈیا میں ۲۰۱۳ء میں چھپوالیا۔ البتہ کرم یہ کیا کہ کتاب کا نام ذرا سا بدل دیا یعنی ''لسانی لغت'' کر دیا اور اسے اردو میں اپنی پہلی پیش کش قرار دیا جب کہ پروفیسر غازی علم الدین کی کتاب مقتدرہ قومی زبان پاکستان جیسے ذی وقار ادارے سے ایک سال پہلے ۲۰۱۲ء میں شائع ہو چکی تھی۔ مذکورہ مقتدرہ اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنا چاہتا تھا جس کے لیے غازی صاحب نے اس عاشقِ ادب سے ایک مضمون کی گزارش کی تھی مگر اس عاشق نے ان کے اپنے الفاظ میں ''غازی علم الدین کی کتاب ''لسانی مطالعے'' کے بطن سے میں نے لسانی لغت تیار کی تھی جو ستمبر ۲۰۱۳ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع ہو کر بے حد مقبول ہوئی۔ اپنی نوعیت کی اس پہلی لغت سے اساتذہ، اہلِ قلم اور طلبا استفادہ کر رہے ہیں۔''

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے پروفیسر غازی علم الدین مجھ پر بڑے مہربان تھے۔ دیرینہ روابط کی وجہ سے وہ اپنی ہر کتاب سے مجھے سرفراز فرمایا کرتے تھے۔ مقتدرہ قومی زبان، پطرس بخاری روڈ، اسلام آباد پاکستان کے زیرِ اہتمام ۲۰۱۲ء میں شائع ہونے والی کتاب ''لسانی مطالعے'' وہ مجھے بھیج چکے تھے جس کا پیش لفظ صدر نشین مقتدرہ قومی زبان ڈاکٹر انوار احمد نے لکھا۔ دیباچہ پروفیسر سیف اللہ خالد اور پیش گفتار خود پروفیسر غازی علم الدین نے ۱۴؍ مارچ ۲۰۱۲ء کو لکھا تھا۔ پیش لفظ، دیباچہ اور پیش گفتار دو دو صفحات پر مشتمل ہے۔ آٹھ چونکانے والے ابواب پر مبنی یہ کتاب صفحہ ۱۳ سے صفحہ ۱۷۹ تک گویا ۱۶۶ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ عنوانات ہیں:

۱۔ زبان کے اخلاقی انحطاط کا نفسیاتی پس منظر (ایک تجزیاتی مطالعہ)

۲۔ الفاظ کا تخلیقی و معنوی و اصطلاحی پس منظر (منتخبِ الفاظ۔ ذولسانی مطالعہ)

۳۔ الفاظ معانی بدلتے ہیں۔ (ایک تجزیاتی مطالعہ)

۴۔ لسانی تحقیق کے کچھ نئے زاویے۔

۵۔ اردو کا عربی سے لسانی تعلق اور اصلاحِ زبان و ادب

۶۔ اردو میں مستعمل عربی الفاظ کی تشکیل اور معنوی وسعت

۷۔ املا میں الفاظ کی جداگانہ حیثیت سے انحراف (ایک تجزیاتی مطالعہ)

۸۔ قومی زبان اور ہمارے نشریاتی ادارے (صفحہ ۱۵۸ تا ۱۷۹)

مذکورہ ''لسانی مطالعے'' عاشق ادب نے صرف نام بدل کر ''لسانی لغت'' کے نام سے ۲۰۱۳ء میں انڈیا سے چھپوا لی البتہ لسانی مطالعے کا آٹھواں باب جو پاکستان کے نشریاتی اداروں کی غلطیوں اور کوتاہیوں کے تذکرے پر مشتمل تھا، نکال دیا کیوں کہ یہ ان کے کام کا نہیں تھا۔

ان کی شامت آئی کہ انھوں نے یہ مسروقہ ''لسانی لغت'' مجھے بھیجی جسے دیکھ کر میں حیران ہوگیا کیوں کہ غازی علم الدین کی اصل کتاب ''لسانی مطالعے'' میرے پاس موجود تھی۔ میں نے تقابلی جائزہ لے کر اس سرقے کے تعلق سے ایک خط ''ایوانِ اردو'' دہلی جولائی ۲۰۱۴ء میں چھپوا دیا۔ اس سرقے کی گونج لکھنؤ کے ''گلبن'' اور راولپنڈی کے ''چہار سُو'' تک پھیل گئی۔

عاشقِ ادب نے ''چہار سُو'' راولپنڈی کے شمارے مئی– جون ۲۰۱۷ء میں دیدہ دلیری سے اعتراف کیا:

> غازی علم الدین صاحب نے مندرجہ بالا مضامین کا مسودہ مجھے ''پیش لفظ'' لکھنے کے لیے بھیجا کہ مقتدرہ قومی زبان سے کتاب شائع ہونے والی ہے۔ پڑھتے اور لکھتے وقت مضامین کے بطون سے میں نے ''لسانی لغت'' تیار کی جس کا اعتراف سات صفحے [کذا] کے پیش لفظ میں، میں نے کیا... یہاں کے سب سے بڑے پبلشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے یہ لغت شائع کی جس کی طباعت کا پورا خرچ غازی صاحب نے برداشت کیا... (''رس رابطے''، ص ۱۱۶)

حالاں کہ پروفیسر غازی علم الدین کی کتاب مقتدرہ قومی زبان پاکستان کے زیرِ اہتمام ۲۰۱۲ء میں ہی چھپ چکی تھی۔ ''چہار سُو'' کے اگلے شمارے جولائی –اگست ۲۰۱۷ء میں پروفیسر غازی علم الدین کا تردیدی بیان شائع ہوا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ۲۔ مجھے تو ''لسانی لغت'' کی اشاعت کے اس منصوبے کا علم ہی نہیں تھا، بھلا میں کس طرح اس کے مصارف برداشت کرتا۔ ہاں ''لسانی لغت'' کی جتنی تعداد میں نے دہلی سے منگوائی اس کی قیمت ادا کی۔ (''رس رابطے''، ص ۱۱۶)

اس سلسلے میں مزید تفصیلات کے لیے اشعر نجمی کے ''سرقہ و توارد نمبر'' مشترکہ شمارہ ''اثبات ممبئی ۱۸/ ۱۹/ جولائی تا ستمبر و اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۸ء میں رؤف خیر کا مضمون ''مناظر پسِ مناظر'' دیکھا جاسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے جہاں تک حقوق اللہ میں بندے سے کوتاہی ہوتی ہے وہ معاف کرسکتا ہے مگر اس نے حقوق العباد معاف کرنے سے خود کو روک رکھا ہے۔ ایک بندے کا حق تلف کرکے اسے اپنے نام کرلینا معاشرے کے ساتھ ادب میں بھی کبھی پسندیدہ شمار نہیں ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ کسی کی شاہ کار کتاب کو اپنے نام سے چھپوالینا۔ پروفیسر غازی علم الدین کی اہم ادبی خدمات کا جائزہ لینا مقصود تھا جس کے ذیل میں یہ ناخوش گوار واقعہ بھی زیرِ بحث آگیا جو اقبالی بیان کی صورت ریکارڈ پر موجود ہے۔

عوام و خواص میں مروج غلط تلفظ اور غلط املا کا غازی صاحب نے بڑی جرأت و جسارت کے ساتھ اپنی شاہ کار کتاب ''لسانی

مطالعے‘‘ میں جائزہ پیش کیا اور غلط کی جگہ صحیح املا و تلفظ کی نشاندہی کی تاکہ غلط کاروں کی اصلاح ہو جائے۔

پہلے باب میں صوفیہ کی شطحیات پیش کی گئیں جو قرآن وسنت کے خلاف ہیں جیسے منصور حلاج کا انا الحق کہنا جس کا سیدھا سادا مطلب ہے کہ میں ہی خدا ہوں۔ اس کے باوجود اسے حق وصداقت کا علم بردار سمجھا جاتا ہے۔ بعض قرآنی الفاظ کا غلط استعمال جیسے بسم اللہ ہی غلط کہنا، پول کھولنے کے لیے الم نشرح کرنا، وغیرہ بعض محاورے بھی قرآنی فکر کے خلاف ہیں جیسے جنم جنم کا ساتھی کہنا جس سے آواگون تناسخ کی تائید ہوتی ہے۔ صلواتیں سنانا گالیاں بکنے کے معنیٰ میں بولنا۔ بھلا دینے کے لیے فاتحہ پڑھنا۔ بھوک لگنے کے لیے آنتوں کا قل ھو اللہ پڑھنا اظہار نفرت اور بے زاری کے لیے لاحول پڑھ دینا۔

’’الفاظ معانی بدلتے ہیں‘‘ کے عنوان سے غازی صاحب نے ایک جامع باب باندھا جس میں انھوں نے بتایا کہ کس طرح عربی کے الفاظ کا اردو میں مفہوم کچھ اور ہو جاتا ہے۔ یہ تمام الفاظ اور محاورے حروف تہجی میں الف بائی ترتیب سے بیان کیے گئے ہیں۔ ان کا صحیح تلفظ بھی اعراب کے ذریعے بتایا گیا ہے۔ اپنی لسانی تحقیق کے ثبوت میں غازی صاحب نے مستند لغات کے حوالے دے دیے جیسے ’’جامع اللغات‘‘، ’’فیروز اللغات‘‘، ’’قاموسِ مترادفات‘‘ اور شان الحق حقی کی ’’فرہنگِ تلفظ‘‘ وغیرہ۔ بیشتر الفاظ کے افاعیل بتا دیے گئے ہیں تاکہ صحیح تلفظ ادا ہو اور اس کی معنویت واضح ہو۔

املا میں الفاظ کو ملا کر لکھنے کے بجائے الگ الگ لکھنے پر ایک پورا باب غازی صاحب نے باندھا ہے جیسے انشاء اللہ کو اِن شاء اللہ، رُوبرو کو رو بہ رو، سرخرو کو سرخ رو، تندرست کو تن درست، کسمپرسی کی جگہ کس مپرسی، دانشور کی بجائے دانش ور، انکو، انکی، اسکو، اسکی کی جگہ ان کو، ان کی، اس کو، اس کی صحیح املا ہے۔ الف بائی حروف تہجی کے اعتبار سے ایسی ایک لمبی فہرست غازی صاحب نے دی الفاظ ملا کر لکھے جائیں تو پڑھنے والا غلط پڑھ سکتا ہے جیسے کسمپرسی کو لوگ ’’کسم پرسی‘‘ پڑھتے ہیں۔

ریڈیو اور ٹیلی وژن پر بے شمار الفاظ کے غلط تلفظ کی بھی غازی صاحب نے نشان دہی کر کے صحیح تلفظ بتایا ہے۔ برسوں کی ایسی تحقیقی کتاب ’’لسانی مطالعے‘‘ کا ٹائپ کیا ہوا مسودہ ملتے ہی بہار کے عاشق ادب کو تو گویا بنا بنایا نوالہ مل گیا انھوں نے بد دیانتی اور بدنیتی سے راتوں رات اسے ہضم کرنے کی کوشش کی مگر یہ ممکن نہ ہو سکا اور غازی صاحب کی اس کتاب کے ’’بطون‘‘ سے اپنی Surrogate کتاب پیدا کرنے کی کوشش کی جو بار آور ثابت نہ ہو سکی۔

غازی علم الدین کی اس شاہ کار کتاب ’’لسانی مطالعے‘‘ کو بلوچستان یونی ورسٹی کوئٹہ نے ایک نوٹیفیکشن کے تحت پی ایچ ڈی کے نصاب میں شامل کیا ہے۔

پروفیسر غازی علم الدین کی ایک اور اہم علمی ادبی کاوش ’’تخلیقی زاویے‘‘ کے نام سے ۲۰۱۷ء میں مثال پبلشرز، فیصل آباد کے زیر اہتمام منظرِ عام پر آئی جس کا انتساب انھوں نے اپنے بڑے بھائی کے نام اس طرح کیا ہے:

’’نامور اہلِ قلم بردارِ محترم محمد صادق قصوری کے نام جن کی شخصیت میرے لیے رول ماڈل ہے۔‘‘

۲۷۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں نہ صرف بعض شخصیات کے فکر وفن پر غازی صاحب کے طویل جامع مضامین شامل ہیں بلکہ بعض شاعروں ادیبوں کی کتابوں پر بھرپور تبصرے بھی ہیں جو غازی علم الدین کی دقتِ نظر کے غماز ہیں۔

ڈاکٹر سیف اللہ خالد جیسے بے باک قلم کار کے تعلق سے ’’عجب چیز ہے لذتِ آشنائی‘‘ کے عنوان سے بیس صفحات کا مضمون ہے جو سیف اللہ کے کاٹ دار فکر و فن کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔ ان کی کتابیں ’’شہاب بے نقاب‘‘ اور شعری مجموعے ’’ریشم جیسے خواب‘‘ اور ’’کبھی تو چاند نکلے گا‘‘ کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔

بزرگ شاعر حضرت خیال آفاقی کے فکر و فن کا ایسا جامع جائزہ غازی صاحب کے علاوہ شاید ہی کسی نے لیا ہوگا۔ ان کا ایک ضرب المثل مطلع ہے:

مجھے قلم، فرہاد کو تیشہ، مجنوں کو کشکول دیا
عشق نے دل والوں کو جو بھی کام دیا انمول دیا

انھوں نے ’’تخلیقی زاویے‘‘ میں سترہ صفحات پر مشتمل ایک بے مثال مضمون ’’رؤف خیر کے فکر و فن پر ایک نظر‘‘ کے عنوان سے میری شعری کلیات ’’خیریات‘‘ اور میرے نثری تنقیدی مجموعے خطّ خیر، دکن کے رتن اور اربابِ فن، بچشمِ خیر، حق گوئی و بے باکی، دکن کی چند ہستیاں، حیدر آباد کی خانقاہیں، علامہ اقبال کے ۱۶۳ فارسی قطعات ’’لالۂ طور‘‘ (پیامِ مشرق) کے میرے منظوم ترجمہ کے حوالے سے اور میرے بعض اشعار، نظمیں، سانیٹ، ترائیلے، یک مصرعی نظمیں دیتے ہوئے ایک جامع بھرپور مضمون لکھا (ایسے ہی دو مضامین ان کے بعد محترم مختار ٹونکی نے لکھے جو ان کے مجموعے ’’فانوسِ خیال‘‘ میں شامل ہیں) ان کے علاوہ پروفیسر مقبول فاروقی نے خاکسار رؤف خیر کے فکر و فن پر طویل مقالہ لکھا جو ’’خیر بچشمِ خیر‘‘ اور ’’حرفِ ہزار معنی‘‘ میں بطور مقدمہ شامل ہے۔ غازی صاحب نے اقبال شناسی پر بھی تفصیل سے لکھا۔ اللہ انھیں جزائے خیر دے کہ وہ قابلِ ذکر قلم کاروں کی خدمات کے اعتراف میں دریا دلی کا مظاہرہ فرمایا کرتے تھے۔ ایسی علمی ہستی سے افسوس کہ دنیائے ادب خالی ہوگئی۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ ہل جزاء الاحسان الا الاحسان۔ بطور خراجِ تحسین جو مضمون لکھا جانا تھا وہ آج خراجِ عقیدت کے انداز میں پیش کیا جا رہا ہے۔



اردو صحافت: ابتدا و ارتقا

(تاریخِ اردو صحافت پر نادر و نایاب مقالات و مضامین)

مرتبہ: ڈاکٹر طاہر مسعود

قیمت: ۱۴۰۰ روپے

انجمن ترقیِ اردو پاکستان، ایس ٹی ۱۰، بلاک ۱، گلستانِ جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی

ڈاکٹر شبیر احمد قادری ❁

حمد و نعت اور سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فروغ میں طاہر سلطانی کا حصہ

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C, Latifabad, Hyderabad.

اس عالمِ رنگ و بُو کے تمام مظاہر بحضورِ حق تعالیٰ سجدہ ریز ہیں۔ انداز جدا ہیں مگر مرکز و محور وہی ذات ہے جو واحد ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، وہی ذات سب جن و انس اور دیگر مظاہر و مناظرِ کائنات کی خالق، مالک اور رازق ہے۔ انسان کو اللہ کریم نے تقریر وتحریر کی جن خوبیوں سے نوازا ہے، وہ اس عطاے بے بہا پر اللہ کریم و رحیم کا بہ دل و جاں شکرگزار ہونا پسند کرتا ہے۔ ذکرِ خفی و جلی دونوں انداز اپناتے ہوئے اس کی صفت و ثنا بیان کرتا ہے۔ جن افرادِ ملّتِ محمدیہ کو لکھنے پڑھنے اور اظہار و بیان کے اوصاف سے نوازا گیا ہے وہ انھیں بروے عمل لاتے ہوئے پروردگار کے حضور سرِ تسلیم ختم کرنا اپنے لیے اعزاز سمجھتا ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ انسان کو ستائش و ثنا کے جتنے قرینوں سے سرفراز کیا گیا ہے، وہ سب اسی ذاتِ واجب کے لیے وقف ہیں۔ اردو میں حمدیہ مجموعے تو موجود تھے مگر فروغِ حمد کے لیے کوئی رسالہ موجود نہیں تھا۔ اللہ پاک نے سعادت کے یہ موتی شاعرِ حمد و نعت طاہر حسین طاہر سلطانی کی جھولی میں ڈال دیے اور انھیں یہ توفیق ارزاں ہوئی اور انھوں نے ''جہانِ حمد'' کے نام سے ۱۹۹۸ء میں کراچی سے ایک کتابی سلسلے کا اجرا کیا۔ اس رسالے کا ہر شمارہ 'خاص شمارہ' کی بنیاد پر شروع کیا گیا اور تادمِ تحریر اس کے بائیس ضخیم و جیم نمبر شائع ہو چکے ہیں جن کی بدولت ادب کے ذخیرے میں کم و بیش آٹھ ہزار صفحات پر مشتمل حمدیہ، نعتیہ اور منقبتی شاعری اور تحقیق و تنقید کا اضافہ ہو چکا ہے۔ طاہر سلطانی کی حبِ الٰہی کا مظہر ایک اور ماہانہ رسالہ ''ارمغانِ حمد'' ہے جس کا اجرا فروری ۲۰۰۴ء میں کراچی سے ہوا۔ اس رسالے کے ایک سو پچیس شمارے شائع ہوئے۔ مذکورہ بالا دونوں حمدیہ رسائل کے الگ الگ اشاریے پروفیسر ڈاکٹر محمد سہیل شفیق (صدر، شعبۂ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی) نے ترتیب دیے۔ یہ اشاریے کتابی صورت میں دستیاب ہیں۔ ان اشاریوں کے مطالعے سے یہ علم ہوتا ہے کہ ربع صدی میں طاہر سلطانی نے تنِ تنہا وہ کام کر دکھایا جو دراصل اداروں کے کرنے کا کام تھا۔ اور یہ سب ان کے خلوص، علمی لگن اور رحمتِ الٰہی اور اذنِ حضور علیہ السلام کی بدولت ممکن ہوا۔ ''ارمغانِ حمد'' کے تحت جن خاص اشاعتوں کا اہتمام کیا گیا، وہ یہ ہیں: حفیظ تائب نمبر، صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نمبر، حضرت عمر فاروقِ اعظم و حضرت امام حسین نمبر، صبا اکبر آبادی حمد و نعت نمبر، خلفاے راشدین نمبر، نعت نمبر، ذکرِ آمدِ مصطفیٰ نمبر، درود و سلام نمبر، ڈاکٹر شمس جیلانی نمبر، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نمبر، سلام گنبدِ خضرا نمبر، گوشۂ صبا اکبر آبادی، عربی و فارسی حمدیہ کلام مع ترجمہ، خطوط نمبر، شاہ انصار الٰہ آبادی حمد و نعت نمبر، حسن اکبر کمال حمد و نعت نمبر، غیر منقوط نعت نمبر، حمدیہ و نعتیہ ہائیکو نمبر، کتابی سلسلہ ''جہانِ حمد'' کراچی ایک شمارہ — ایک کتاب۔ سلسلے کے تحت درج ذیل اشاعتوں سے حمد و نعتیہ ادب کا دامن مالا مال کیا گیا۔ خواتین حمد و نعت

❁ صدر شعبۂ اُردو، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، ستیانہ روڈ، فیصل آباد، ۷۸۸۳۶۶۳۔۰۳۰۰

نمبر، مناجات نمبر، اردو حمد کا ارتقا نمبر، تذکرہ غیر مسلم حمد گو نمبر، بہزاد لکھنوی نمبر، صبا اکبر آبادی حمد و نعت نمبر، مولانا احمد رضا حمد و نعت نمبر، علامہ اقبال حمد و نعت نمبر، سیّد الشہدا امیر حمزہ نمبر، جہانِ حمد قرآن نمبر/قرآنی انسائیکلو پیڈیا۔

''جہانِ حمد'' کا ''رسولِ اعظم نمبر'' چھ جلدوں پر مشتمل ہے اور انھیں دنیا بھر سے ممتاز اربابِ فکر و دانش کے تحقیق اساس اور عقیدت خیز مقالات و مضامین اور منظومات سے آراستہ کیا گیا ہے۔ معاون حافظ محمد نعمان طاہر و برادران ہیں۔ اداریے میں مدیرِ گرامی قدر نے ''سیرت نمبر'' کی ترتیب و پیش کش اور اشاعت کے محرکات اور جلد اوّل کے مندرجات و مشتملات اور ذاتِ والا صفات کے پیغمبرانہ کمالات و مراتب اور مقام کے حوالے سے منفی آرا دینے والوں پر سخت گرفت کی۔ طاہرؔ سلطانی ''رسولِ اعظم نمبر'' کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتے ہیں۔ موصوف لکھتے ہیں، ''حقیقت تو یہ ہے کہ آپ ﷺ کی مدح سرائی کے لیے میری زبان میں قوتِ گویائی نہیں، فکر میں طاقتِ پرواز مفقود، قلم آمادۂ جنبش نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جس محبت کے ساتھ ثنائے رسول، ربِ کائنات نے بیان کی، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ سوال یہ ہے کہ محب کا محبوب کو دنیا میں بھیجنے کا مقصدِ اعلیٰ کیا تھا؟ یہی نا کہ بھٹکے ہوئے انسانوں کو نہ صرف راہِ مستقیم پر لایا جائے بلکہ اس بیمار معاشرے کی اصلاح و کردار سازی کی جائے۔ آج ہم پھر چودہ سو برس پیچھے کیوں چلے گئے ہیں۔ اس وقت میری قلبی کیفیات یہ ہیں کہ مسرت اور خوف کا ملا جلا رجحان موجود ہے۔ خوشی اس لیے ہے کہ الحمدللہ محبوبِ کبریا، سرورِ انبیا، مقصودِ کائنات، صاحبِ معراج، رحمۃ للعالمین، شافعِ محشر، جانِ دو عالم، حضورِ پُرنور، آقائے نامدار حضرت محمد ﷺ کی سیرتِ مطہرہ کے ایمان افروز حوالے سے ''جہانِ حمد'' کی خصوصی اشاعت بنام ''مصطفیٰ جانِ رحمت'' (رسولِ اعظم نمبر) جو کہ چھ جلدوں پر مشتمل ہے، کو بصد ادب و احترام اللہ عزوجل کی بارگاہ میں پیش کرنے کے بعد بارگاہِ رسالت مآب آں حضرت ﷺ میں انتہائی احترام کے ساتھ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ یقیناً یہ عمل اُن نامور اور معتبر قلم کاروں، جن میں قابلِ احترام علمائے کرام، مشائخِ عظام بھی شامل ہیں اور وہ اب ہم میں موجود نہیں، اِن شاء اللہ ان تمام مرحومین کی نجات کا ذریعہ بنے گا۔'' (اداریہ، ص ۱۹، ۲۰، ۳۲)

علامہ عبدالجبار احمد نقش بندی اور ڈاکٹر ریاض مجید کی آرا شامل ہیں۔ ثانی الذکر نے اس کاوش کو ''سیرتی دستاویز'' قرار دیا ہے۔

پہلی جلد درجِ ذیل چار ابواب پر مشتمل ہے:

★ اُمہات و آبائے مصطفیٰ ﷺ

★ ظہورِ مصطفیٰ ﷺ

★ میلادِ مصطفیٰ ﷺ

★ سیرت و سراپائے مصطفیٰ ﷺ

ان ابواب میں علامہ ابنِ حجر مکی، مولانا غلام امام شہید، علامہ شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ راشد الخیری، امام احمد رضا خاں، مولانا نعیم الدین مراد آبادی، علامہ عبدالعلیم صدیقی، علامہ احمد سعید شاہ کاظمی، علامہ عبدالمصطفیٰ اعظمی، نسیم حجازی، خواجہ محمد عبدالغفور ہزاروی، علامہ محمد شفیع اوکاڑوی، مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری، حکیم محمد سعید شہید، نسیم حجازی، حاجی محمد حنیف طیب اور راجا رشید محمود کی تحریریں بھی شامل ہیں۔ پہلی جلد ۲۷۷ صفحات کو محیط ہے۔

دوسرے حصے کے اداریے میں مدیرِ گرامی قدر نے نبیِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے عدل و انصاف کے حوالے سے احکامات کا ذکر کرتے ہوئے خطبۂ حجۃ الوداع کا بطورِ خاص تذکرہ کیا ہے۔ طاہر سلطانی لکھتے ہیں، ’’عدل و انصاف کے نعرے بڑے زور شور سے لگائے جاتے ہیں مگر عملی طور پر یہ نعرے کھوکھلے ثابت ہوتے ہیں۔ عدل و انصاف اُسی وقت ممکن ہے کہ جب حکمرانِ وقت اپنے اغراض و مفادات کو بالائے طاق رکھ دیں کہ یہی ایک صورت ہے عدل و انصاف کے نفاذ کی۔‘‘ (اداریہ، ص ۱۹)

دوسری جلدی چھ ذیلی حصوں میں منقسم ہے:

★ تبلیغِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

★ معراجِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

★ غارِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

★ ہجرتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

★ غزواتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

★ تعلیماتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

محولہ بالا موضوعات پر جن اربابِ دانش و حکمت کے مقالات منتخب کیے گئے، ان میں سے چند معروف نام ملاحظہ ہوں: مولانا سیّد محبوب رضوی، طالب ہاشمی، الحاج شمیم الدین، ڈاکٹر محمد شکیل صدیقی، امام احمد رضا خان، علامہ سیّد حسنین رضا خان، علامہ سیّد احمد سعید کاظمی، ملک محبوب الرسول قادری، علامہ عبدالمصطفیٰ اعظمی، محمد اقبال نجمی، ڈاکٹر شمس جیلانی، علامہ سیّد سلیمان ندوی، راجا رشید محمود، ڈاکٹر جہاں آرا لطفی، محمد عثمان نوری، ڈاکٹر افضالہ شاہین، آفاق صدیقی، شبیر احمد انصاری، خواجہ رضی حیدر، عقیل احمد عباسی اور طاہر سلطانی۔ اس جلد میں علامہ سیّد بسم اللہ شاہ قادری، الطاف مجاہد، محمود شام، عارف ہاشمی اور یامین وارثی کے تاثرات شامل ہیں۔ محمود شام نے ’’رسولِ اعظم نمبر‘‘ کو ایک انسائیکلو پیڈیا قرار دیتے ہوئے لکھا ہے: ’’طاہر سلطانی سفیرِ حمد و نعت، شاعرِ حمد و نعت، شہرِ قائد کی ان چنیدہ ہستیوں میں سے ہیں جن کی زندگی کی ہر سانس حمد و نعت کے لیے وقف ہو چکی ہے۔ یہ خاص عنایت ہوتی ہے قادرِ مطلق کی کہ وہ اپنے ان منتخبِ روزگار خاص افراد کو ایسی خصوصیات، صلاحیتوں اور اہلیت سے بھی نوازتا ہے کہ وہ حمد و نعت کے مقدس گلستانوں میں نئے پھول کھلاتے ہیں۔ زمانے بھر کی محبتیں، عقیدتیں اور الفتیں یکجا کرتے ہیں۔‘‘ (فلیپ اوّل)

تیسری جلد کے افتتاحیہ کے بعد درجِ ذیل چھ ابواب کے تحت مقالات شامل کیے گئے ہیں:

★ شانِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

★ تعظیم و توقیرِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

★ علومِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

★ معجزاتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

★ احادیثِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

★ عشقِ مصطفیٰ ﷺ

مقالہ نگاروں کے نام ملاحظہ ہوں: امام احمد رضا خاں، مفتی احمد یار خان نعیمی، ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری، ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی، ڈاکٹر صحبت خان کوہاٹی، خالد حسن امروہوی، مولانا نور بخش توکلی، ڈاکٹر شمس جیلانی، علامہ محمد تاج الدین چشتی، سیّد آلِ احمد بلگرامی، ڈاکٹر حافظ محمد ثانی، علامہ محمد عبداللہ طاہر اختر القادری، مولانا نقی علی خاں، علامہ سیّد ریاض الدین سہروردی، ڈاکٹر محمد شکیل اوج، ڈاکٹر مسعود احمد، ڈاکٹر محمد سہیل شفیق، علامہ سیّد شجاعت علی قادری، شاہ احمد سعید فاروقی، مولوی محمد سہیل، علامہ عطاء اللہ بن عبدالغفار، شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی، شاہ تراب الحق قادری، مولانا زوار حسین شاہ، علامہ کرم شاہ الازہری، صوفی محمد اکرم رضوی، پروفیسر خیال آفاقی، ڈاکٹر سعید احمد صدیقی، محمد رفیق مغل، عرفان صدیقی، علامہ فیصل عزیز بندگی، پروفیسر ڈاکٹر مجید اللہ قادری، محمد قمر رحمانی، عقیل احمد عباسی۔ اداریے میں طاہر سلطانی نے مسلم اُمہ کے زوال و ادبار اور اسے درپیش عصری مسائل کا بڑا سبب اللہ کریم کے فرمودات اور رسولِ اکرم ﷺ کی تعلیمات سے انحراف بتایا ہے۔

''جہانِ حمد''، رسولِ اعظم نمبر، مصطفیٰ جانِ رحمت کی چوتھی جلد کو درجِ ذیل حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

★ ختمِ نبوت بر مصطفیٰ ﷺ

★ امہات المومنین، ازواجِ مصطفیٰ ﷺ

★ اہلِ بیتِ مصطفیٰ ﷺ

★ عشرۂ مبشرۂ مصطفیٰ ﷺ

★ اصحابِ مصطفیٰ ﷺ

★ دربارِ مصطفیٰ ﷺ

★ شفاعتِ مصطفیٰ ﷺ

★ وسیلۂ مصطفیٰ ﷺ

★ دیدارِ مصطفیٰ ﷺ

★ شہرِ مصطفیٰ ﷺ

امام احمد رضا خاں، حافظ عبدالرحمٰن، پروفیسر محمد حسین آسی، محمد طاہر عبدالرزاق، ڈاکٹر محمد عبدالحئی چترالی، شاہ احمد نورانی، ڈاکٹر محمد سہیل شفیق، راجا رشید محمود، ملک ارشاد عرشی، ڈاکٹر شمس جیلانی، ڈاکٹر افضال احمد انور، ندیم احمد ندیم قادری، شاہ مصباح الدین شکیل، ڈاکٹر فرحت ناز رحمٰن، علامہ محمد افروز قادری چریا کوٹی، علامہ محمد مہر الدین، علامہ سیّد بسم اللہ شاہ، علامہ ابوالحسن علی تقی الدین سبکی شافعی، علامہ سیّد عبداللہ محمد بن الصدیق، مولوی محمد زکریا، سیّد قمر الحسن ضیغم قادری، ڈاکٹر محمد الیاس عبدالغنی، محمد اقبال صدیقی، ریحانہ تبسم فاضلی، ممتاز مفتی، تسلیم الٰہی زلفی، رضوان صدیقی اور دیگر احبابِ فکر و نظر کے مقالات شائع کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ جلد رضوان صدیقی، سیّد محمد اصغر کاظمی، شجاع الزماں خان شاد، شارق رشید، فیصل حسن نقش بندی، پروفیسر انوار احمد شیخ، علامہ مفتی عبداللہ حسان طاہر اختر

القادری، پیرزادہ سیّد خالد حسن رضوی، نشید آفاقی، برکت علی قادری، عقیل احمد عباسی اور طاہر سلطانی کے مقالات اور منظومات سے آراستہ ہے۔

رسولِ اعظم نمبر کے پانچویں جلد کے مندرجات کو چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ ستائیسویں باب سے لے کر اکتیسویں باب تک شامل ہیں۔فہرست ملاحظہ ہو:

★ یادگار مساجد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
★ معالجاتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
★ مقاصدِ مدحتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
★ مدحت نگارانِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
★ منظوم مدحت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
★ نذرانہ درود وسلام بحضورِ خیر الانام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

محولہ بالا موضوعات کے حوالے سے جن اہلِ قلم کی تحریریں شامل ہیں، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: پیرزادہ عاشق احمد فاروقی مدنی، مولانا محمد شفیع اوکاڑوی، ڈاکٹر جہاں آرا لطفی، ضیاء الرحمٰن چترالی،، ڈاکٹر محمد عبدالحیٔ، حکیم محمد سعید، ڈاکٹر رفیع الدین اشفاق، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، پروفیسر شفقت رضوی، ڈاکٹر شوکت زریں چغتائی، ڈاکٹر شبیر احمد قادری، مولانا محمد الیاس عطار قادری، محسن اعظم محسن ملیح آبادی، مفتی خرم غزالی اور طاہر سلطانی کے مقالات شامل ہیں۔ مدحت نگاروں کے بارے میں ڈاکٹر عبداللہ، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نقش بندی، ڈاکٹر ریاض مجید، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، خواجہ رضی حیدر، ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر شاداب احسانی، ڈاکٹر طاہر قریشی، ڈاکٹر حافظ حقانی میاں قادری، ڈاکٹر محمد انور خان، ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان، پروفیسر غازی علم الدین کے مضامین اس جلد کی زینت ہیں۔جن شعرا کا کلام شامل کیا گیا ہے۔ان کے نام یہ ہیں: امام شرف الدین بوصیری، امام احمد رضا خاں، کرامت علی شہیدی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمد اسماعیل میرٹھی، مولانا ضیاء القادری بدایونی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسن رضا خان، مولانا عبدالمجید آنولوی، منور بدایونی، عبدالرحمٰن جامی، امیر مینائی، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان، امجد حیدر آبادی، اقبال عظیم، مفتی احمد یار خان نعیمی، علامہ عبدالمصطفیٰ الازہری، شاہ محمد سلطان میاں شیر سبحانی الجیلانی، علامہ حسنین رضا خاں، صبا اکبر آبادی، شاعر لکھنوی، بہزاد لکھنوی، منور بدایونی، ماہر القادری، ذہین شاہ تاجی، عنبر شاہ وارثی، جامی بدایونی، فدا خالدی، نازش حیدری، شاہ انصار حسین الہٰ آبادی، مظفر وارثی، حفیظ تائب، علامہ ریاض الدین سہروردی، علامہ رشید ترابی، وقار صدیقی، علامہ طالب جوہری، احمد ندیم قاسمی، افسر ماہ پوری، جوہر سعیدی، نور بریلوی، حنیف اسعدی، اعجاز رحمانی، ادیب رائے پوری، قمر انجم، مجید امجد، شفیق احمد فاروقی مدنی، جمیل عظیم آبادی، مسرور کیفی، اقبال عالم، حسن اکبر کمال، عزم بہزاد اور عبدالقدیر صدیقی۔ڈاکٹر ریاض مجید نے ''فیضانِ نعت وتوصیفِ نعت'' کے عنوان کے تحت طاہر سلطانی کے قصیدے پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ پروفیسر خیال آفاقی، پروفیسر محمد آصف خان علیمی اور نصر اللہ غالب کے مضامین بھی شامل ہیں۔ پروفیسر منظر ایوبی کی زیرِ صدارت منعقدہ مشاعرے میں پڑھا گیا کلام بھی اس شمارے کی زینت ہے۔

علامہ عبدالعزیز عرفی، علامہ کوکب نورانی اوکاڑوی، ابوہریرہ محی الدین، طاہر سلطانی، حافظ عبدالغفار حافظ اور خالد عرفان کی درود وسلام کے بارے میں تحریریں منتخب کی گئی ہیں۔ امیر مینائی، آغا حشر کاشمیری اور اختر سعیدی کی مناجاتیں اور رضوان صدیقی، اختر سعیدی، محمد یاسمین وارثی اور محمد قمر خان رحمانی نے اپنی تحریروں میں طاہر سلطانی کی کاوشوں کو سراہا ہے۔

اسی طرح مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ''جہانِ حمد'' کے ''رسولِ اعظم نمبر'' کی چھٹی اور آخری جلد بھی گراں مایہ مضامین ومنظومات سے آراستہ ہے۔ اس جلد کو درج ذیل حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

- ★ سیرت نگاری مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
- ★ سفیرانِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
- ★ دینِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
- ★ سزائے شاتمِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
- ★ ۸۷ سال میں شائع ہونے والے رسول نمبر

جن مقالہ نگاروں نے محولہ بالا موضوعات کے بارے میں اظہارِ خیالات کیا ہے، ان کے نام یہ ہیں: رضا تیمور، ڈاکٹر سیّد عزیز الرحمٰن، ڈاکٹر زیبا افتخار، ڈاکٹر محمد سہیل شفیق، ڈاکٹر حافظ محمد ثانی، ڈاکٹر صلاح الدین ثانی، ڈاکٹر عبدالصمد، الشیخ باقر کتانی، سیّد محمد مبشر قادری، مفتی احمد میاں برکاتی، نجیب عمر، ابوالکریم مولانا اشتیاق احمد سلطانی، علامہ غلام رسول سعیدی، حافظ طاہر محمود اشرفی سمیت دیگر ممتاز اہلِ قلم میں اصغر کاظمی، ڈاکٹر شبیر احمد قادری، شبیر احمد انصاری، یاور مہدی، سیّد سخاوت الوری، رانا خالد محمود قیصر اور بیگم شبنم عباس نے طاہر سلطانی کی خدمات کو سراہا ہے۔ رونق حیات اور لیاقت علی پراچہ نے فلیپ لکھے ہیں۔ ان چھ جلدوں پر مشتمل ''رسولِ اعظم نمبر'' مرتب طاہر حسین طاہر سلطانی کی محنت اور لگن کا تقدیسی مظہر ہے۔ اس ضمن میں انھیں حافظ محمد نعمانی طاہر، محمد سلیمان طاہر، عبدالرحمٰن طاہر اور عبداللہ حسان طاہر، لیاقت علی پراچہ کی معاونت حاصل رہی۔ یوں ایک شاہکار منظرِ عام پر آیا اور سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق تحقیقی سرمائے میں بیش قیمت اضافہ ہوا۔ اس اشاعتِ خاص پر مدیر گرامی قدر شاعرِ حمد ونعت طاہر حسین طاہر سلطانی کو جتنا بھی خراجِ تحسین پیش کیا جائے، وہ کم ہے کہ وہ نامساعد حالات کے باوجود حمد ونعت ریسرچ سینٹر، ادارۂ چمنستانِ حمد ونعت ٹرسٹ (رجسٹرڈ) حضرت علی مدرسۃ القرآن، حضرت خدیجۃ الکبریٰ مدرسۃ القرآن برائے خواتین ایسے اداروں کی نگرانی کا فریضہ ادا کر رہے ہیں۔ اپنی حمدیہ ونعتیہ اور منقبتی کتب کے ساتھ ساتھ دیگر اہلِ قلم کی سیکڑوں کتب کی ترتیب واشاعت کا اہتمام کر چکے ہیں۔ اب موصوف اس امر کے لیے کوشاں ہیں کہ وہ حمد ونعت ریسرچ سینٹر کا بڑے پیانے پر اہتمام کر کے حمد ونعت کے جاری مشن کو زیادہ مربوط انداز سے آگے بڑھا سکیں۔

عشرت معین سیما❀

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C, Latifabad, Hyderabad.

اردو ناول میں علاقائی رنگ: برصغیر سے یورپ تک

گرچہ ادیب و شاعر کے لیے اپنا فن تراشا زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ادب کو جب تاریخ اور ثقافت کے ساتھ جوڑا جائے تو دنیا کے ہر خطے کا ادب اپنے عہد کا ترجمان اور خطے کی تاریخ کا نشان بن جاتا ہے۔

اردو ناول نگاری میں بھی ''علاقائی رنگ'' یا مصنف کی تشکیل کردہ ''مقامی فضا'' ایک اہم فنی عنصر مانا جاتا ہے۔ اسی عنصر کے تحت کسی بھی خطے کے مخصوص تمدنی، معاشرتی، ثقافتی اور لسانی پہلوؤں کی عکاسی ہمیں ادب کے پس منظر میں دکھائی دیتی ہے جو افسانہ یا ناول کی جزیات کا اہم حصہ ہے۔ یہ جزیات میں ملفوف علاقائی رنگ ناول کو نہ صرف ایک مخصوص جغرافیہ سے جوڑتے ہیں بلکہ کرداروں، زبان، رسوم و رواج، رہن سہن، اور فضا میں ایک ایسی گہرائی پیدا بھی کرتے ہیں جو قاری کو کہانی کے ماحول کی مکمل اور واضح تصویر بھی پیش کرتے ہیں۔ اردو ناول اور افسانے میں اپنے خطے کے علاقائی رنگ اور مقامی تہذیب و ثقافت کی عکاسی ہمیں اکثر معروف ناولوں میں دکھائی دیتی ہے۔ وہاں پر ناول کی تکنیک کو پر اثر بنانے کے لیے کرداروں کے ذریعے مخصوص علاقے کی تہذیب و روایات پیش کرنے کے موثر طریقہ کار کا خیال رکھا جاتا ہے اور ساتھ ساتھ کرداروں اور مناظر کے حوالے سے جملوں اور مکالموں میں بھی علاقے کی انفرادیت پیش کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ اردو ناولوں کے اکثر کردار اپنے علاقے و تہذیب کے حوالے سے فطری سطح پر تراشے جاتے ہیں۔ کرداروں کی زبان اور لہجہ و مکالمے ناول میں پیش کردہ ماحول کی عکاسی کرتے ہیں جو ناول کو حقیقت سے قریب تر لے جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان عناصر کے تحت کبھی کبھی اسی خطے میں بسنے والے قارئین اُن ناولوں اور اُن کے کرداروں سے اپنی جذباتی وابستگی بھی محسوس کرتے ہیں۔ جس کی عمدہ مثال منشی پریم چند کے ناول ''گئو دان'' اور ''میدانِ عمل'' ہیں جن میں اودھ کے دیہی علاقوں کا رنگ ناول کے پس منظر میں نمایاں ہے اور ساتھ ہی کرداروں کا دیہاتی لہجہ و زبان، سماجی سطح پر زمینداری کے نظام اور طریقہ کار کو حقیقت سے بہت قریب محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح قرۃ العین حیدر اور عبدالحلیم شرر بھی علاقائی رنگ میں پیش کیے گئے ناول کے حوالے سے اپنی معروف پہچان رکھتے ہیں۔ قرۃ العین کا معرکہ آرا ناول ''آگ کا دریا'' اس کی بہترین مثال ہے جہاں ہندوستان کی مختلف علاقائی تہذیب اپنے ادوار میں تاریخی سطح پر نمایاں ہیں۔ چاہے وہاں بات لکھنؤ کی معروف تہذیب کی ہو یا دہلی کی بنتی بگڑتی ثقافت کی یا بنگال کی فضا کی۔ یہاں یہ ثقافت نمایاں ہو کر قاری کو اُن علاقوں اور عہد کی بھی سیر کروا دیتی ہے جہاں حقیقی طور پر اس نے قدم نہ رکھے ہوں۔ اسی طرح عبدالحلیم شرر اپنے ناول میں تاریخی سطح پر ہندوستان کا وہ نقشہ پیش کرتے ہیں کہ اُن کا قاری خود کو بذریعہ

❀ جرمنی

ناول اس عہد میں اور اس ماحول میں سانس لیتا ہوا محسوس کرتا ہے۔اس کے علاوہ پاکستان میں شائع ہونے والے آج یا آج سے چند سال قبل لکھے جانے والے بلوچی، سرائیکی، پشتو اور پنجابی زبان کے علاقائی ناول کا مطالعہ کیا جائے تو وہاں بھی علاقائی ادب سے متاثر اردو ناول اور کہانیاں بھی منظرِ عام پر نظر آتی ہیں۔ میر واہ کی راتیں، روحزن، تکون کی چوتھی جہت، چار درویش اور ایک کچھوا اور کئی نامور ناول اور ان کی کہانیوں میں مقامی زبانوں، تہذیبی حالات، روایات اور سماجی مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے جو ہمارے خطے میں لکھے جانے والے ادب کو اپنے عہد کے ساتھ جوڑتا ہوا تاریخ کا ایک حصہ بھی بن گیا ہے۔اس لیے یہ بات عہد حاضر میں لکھے جانے والے ادب اور خاص طور پر صنف ناول میں نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ علاقائی رنگ اردو ناول نگاری میں فطری اور حقیقت پسند فضا کو نمایاں کریں بلکہ مختلف علاقوں کے مسائل، سوچ، اور ثقافت کو بھی ادب کا حصہ بنائیں ہے۔تا کہ اردو ناول ہمہ جہت ہو کر ایک قومی بیانیہ پیش کرنے کے قابل بھی سمجھا جائے۔

اردو ناول میں گرچہ برصغیر پاک و ہند کے مختلف علاقوں کی تہذیب اور زبان و ثقافت خطے کے عہد کی ترجمان ہے اور کئی سماجی مسائل کی آئینہ دار بھی لیکن اس کے باوجود اردو زبان کی وسعت ہمیں برصغیر پاک و ہند سے آگے نئی بستیوں کے مسائل اور زندگی کی جھلک بھی اپنے ادب میں دکھلاتی ہے۔ چوں کہ یہاں ذکر اردو ناول کا ہو رہا ہے لہٰذا اگر سماجی سطح پر اردو ناول میں علاقائی و تہذیبی رنگ برصغیر پاک و ہند سے آگے دیکھے جائیں تو ہمیں یہاں بھی اردو ناول میں علاقائی سطح پر ایشیا سے لے کر یورپ و امریکا و افریقا کی زندگی بھی تلاش کرنے سے مل جاتی ہے۔زیادہ تر بیرونِ پاک و ہند ہمیں یہ جھلک مغربی اور دیگر غیر زبان تراجم کی صورت میں شائع کیے گئے ناول اور افسانوں میں ملتی ہے لیکن اردو افسانہ اور ناول نگاروں نے بھی اپنے فن تحریر میں اُن علاقوں کی تاریخ اور سماجی مسائل کو اردو کی نئی بستیوں کے حوالے سے موضوع بنایا ہے۔ جہاں تک بات اردو ناول نگاری میں یورپ اور جرمنی کے علاقائی رنگ کی ہے تو اس سلسلے میں مغرب کے دیگر حصوں کی فضا اور ماحول کی عکس بندی نسبتاً کم ہے مگر اس حوالے سے جتنا بھی ادب اور خاص طور پر ناول تحریر کیا گیا ہے وہ نہایت اہم اور گہرے ادبی انداز میں رقم کیا گیا۔اُن ناولوں میں علاقائی عکس بندی زیادہ تر اُن مصنفین کے ہاں نظر آتی ہے جو خود یورپ میں مقیم رہے یا جنھوں نے مغربی دنیا کے تمدن، فکر، اور تضادات کو قریب سے دیکھا۔اس فضا کی جھلک زیادہ تر تہذیبی، فکری اور سماجی سطح پر نظر آتی ہے لیکن جغرافیائی یا تاریخی سطح پر اُن پیش کردہ ادب میں خطے سے مربوط مناظر اور کردار بہت کم ہیں۔اگر ہم یہاں قرۃ العین حیدر کے ناول آگ کا دریا اور چاندنی بیگم کا حوالہ یورپ کی زندگی یا لندن و پیرس کے ساتھ ساتھ دیگر یورپی شہروں کے شب و روز کے ساتھ پیش کریں تو انھوں نے بھی اُن تمام شہروں اور علاقوں کو محض ان کے ماحول اور جگہ کے طور پر برتنے کے بجائے تہذیبی وفکری تضاد کے استعارے کے طور پر پیش کیا ہے قرۃ العین حیدر نے یورپ، خاص طور پر لندن، پیرس اور دیگر مغربی شہروں کے ماحول کو محض جگہوں کے طور پر نہیں بلکہ ایک تہذیبی وفکری تضاد کے استعارے کے طور پر برتا۔ان کے مغربی دنیا میں رہنے یا ہجرت کرنے والے کردار، وہاں کے انفرادی مزاج، تنہائی کے مثبت اثرات، سائنسی ترقی، اور روحانی خلا کو محسوس کرتے ہیں لیکن بھرپور انداز میں بیان کرنے سے قاصر ہیں اسی طرح انتظار حسین کے ناول ''آگے سمندر ہے'' میں ناول کی مرکزی فضا تو کراچی ہی ہے، لیکن اس میں مہاجرت، ثقافتی تصادم، اور مغربی تہذیب کے اثرات کے تناظر میں یورپ اور مغرب کا تاثر شامل ہے۔انتظار حسین کے افسانوں

میں بھی کبھی کبھار یورپی فضا کے ٹکڑے جزوی طور ملتے ہیں، خاص طور پر جب تہذیبوں کے زوال وتغیر کی بات ہوتی ہے لیکن اُن کی جانب سے بھی مکمل سطح پر مغربی معاشرے کی ثقافت یا تہذیب کو بنیاد بنا کر کہانی تحریر نہیں کی گئی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی اور گیان چند جین اردو کے معروف ناول نگار ہیں۔ فاروقی صاحب کے ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' میں اگرچہ براہِ راست یورپ یا جرمنی کی فضا پیش نہیں کی گئی ہے لیکن مغرب کے فلسفہ، لسانیات اور تہذیبی اثرات کا یہاں گہرا مطالعہ موجود ہے۔ البتہ ان کے تنقیدی مضامین میں مغربی ادب اور ماحول پر بات ملتی ہے۔ لیکن وہ تخلیقی ادب سے ذرا ہٹ کر ہے۔

حالیہ دور میں کئی ادیبوں اور شاعروں نے مغرب میں مقیم ہندوستانیوں و پاکستانیوں کی زندگی کو موضوع بنایا۔ ان کے ہاں جرمنی، ناروے، ہالینڈ اور برطانیہ جیسے ممالک کی فضا بالخصوص تارکین وطن کی تنہائی، شناخت کا بحران، اور ثقافتی دوہریت کو مؤثر طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں جرمنی کے حوالے سے بات کی جائے، تو اس کی عکس بندی محدود ہے، مگر کچھ اردو سفرناموں اور افسانوں میں جرمن معاشرت، نظم وضبط، صنعتی ترقی، اور مابعد جنگی ماحول پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

نان فکشن لٹریچر میں سفرناموں میں یورپ، خاص طور پر جرمنی کے شہروں، تاریخی پس منظر، اور فکری ماحول کی جھلکیاں ابنِ انشا، یا مستنصر حسین تارڑ اور کچھ نئے لکھنے والوں کے یہاں موجود ہیں اور جرمن معاشرے کو کہیں طنزیہ اور کہیں تاریخی سطح پر سنجیدہ انداز میں رقم کیا گیا ہے لیکن اردو ناول میں یورپ اور جرمنی کی فضا کا استعمال زیادہ تر یہاں بسنے والے لوگوں کی ذہنی کیفیات، ثقافتی تصادم یا تہذیبی وسماجی مکالموں کی صورت میں ناپید دکھائی دیتا ہے۔ اس وقت جرمنی اور یورپ کے دیگر اردو ناول نگاروں کی جانب سے معاشرتی عکس بندی اور کرداروں کی تشکیل کے لیے اردو ادب منتظر ہے تاکہ برصغیر پاک وہند سے آگے بسی نئی اردو کی بستیاں خود کو اس معاشرے میں بین الاقوامی سطح پر نمایاں محسوس کروا سکیں اور سماج سے مربوط زندگی کی متعلقہ فکری وسعت بیان کر سکے۔ یورپ اور امریکا و کینیڈا میں بسے ناول نگاروں کی یہ کوشش جاری ہے کہ اردو ناول نگاری کے زریعے وہ اس نئی بستی میں نمایاں ہوں تاکہ یہاں کا مقامی قاری بھی خود کو کیفیتِ اظہار اور معاشرے میں انضمام کے لیے اپنی راہ تلاش کا تعین کر سکے۔



مولوی عبدالحق بطور مرتب و مدوّن

ڈاکٹر شازیہ عنبرین

قیمت: ۱۰۰۰ روپے

انجمن ترقیِ اردو پاکستان، ایس ٹی ۱۰، بلاک ۱، گلستانِ جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، کراچی

عقیل دانش ❁

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C, Latifabad, Hyderabad.

صفدر علی انشا: مسکراہٹوں اور تبسم کا حسین سنگم

سہ ماہی ''انشاء'' کے مدیر محترم صفدر علی انشا، خوش فکر شاعر ہیں، معتبر ادیب ہیں، ژرف نگاہ ناقد ہیں اور بہت کامیاب مدیر ہیں۔ ابنِ انشا نے اپنی جولاں گاہ نثر کو بنایا تھا یہ اور بات کہ اُن کی شاعری نے بھی اردو دنیا میں دھوم مچا دی تھی۔ صفدر علی انشا شعر کے علاوہ بہت خوب صورت نثر بھی لکھتے ہیں جس کی جھلکیاں اُن کے اداریوں میں نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے اداریوں میں بعض اوقات ایسی چبھتی ہوئی باتیں کہہ جاتے ہیں جو پڑھنے والے کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ اردو شاعری کی تاریخ میں طنز اور مزاح لکھنے والے خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ طنز لکھنے والے کو پہلے خود کو نشانہ بنانا پڑتا ہے۔ وہ جب تک خود پر نہ ہنسے کسی اور پر ہنسنے کا سوچ بھی نہیں سکتا اور خود پر ہنسنے کے لیے جگر چاہیے۔ محترم صفدر علی انشا بہت شگفتہ، ہلکے، مدھم اور دل کش الفاظ میں ایسی بات کہہ جاتے ہیں کہ قاری بے ساختہ مسکرا دیتا ہے۔ اور کبھی کبھی قہقہہ لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جب یہ قہقہہ ختم ہوتا ہے تو اس کے پہلو میں آنسوؤں کی نمی عود کر آتی ہے اور صفدر صاحب زبانِ حال سے کہتے نظر آتے ہیں:

اپنی خوشی میں تم مرا غم بھی نباہ دو
اتنا ہنسو کہ آنکھ سے آنسو نکل پڑیں

سامعینِ کرام! دراصل غم کا اور خوشی کا، مسکراہٹ اور قہقہے کا جنم جنم کا ساتھ ہے۔ راقم الحروف نے عرض کیا تھا:

پُرزور قہقہوں کا نتیجہ بھی اشک ہیں
گویا حدودِ غم سے کہیں بھی مفر نہیں

محترم صفدر علی انشا نے زندگی گزاری نہیں ہے بلکہ زندگی ''کی'' ہے اور:

زندگی کرنے کو جگر چاہیے

وہ سماج کے مختلف کرداروں کے متعلق سوچتے ہیں، اُن کے مسائل پر غور کرتے ہیں۔ جہاں میں اور آپ سماج کی بے راہ روی، معاشرے کی زیادتیوں اور ماحول کی ناانصافیوں پر جھنجھلا کر رہ جاتے ہیں، وہاں صفدر علی انشا ان مسائل اور مصائب کو اپنے طنز اور مزاح کا نشانہ بناتے ہیں۔ جن کے متعلق وہ کچھ کہتے ہیں، وہ افراد اُن کے اردگرد نظر آتے ہیں۔ اکثر وہ خود بھی اسی طنز کا نشانہ بنا دیتے ہیں کہ وہ بھی اسی ماحول کا ایک حصہ ہیں۔ اُن کی جولاں گاہ اردو کی روایتی شاعری کی طرح صرف مُلّا، زاہد اور شیخ ہی نہیں ہے بلکہ ہمارے

❁ استاد، شعبۂ اردو، لندن یونی ورسٹی، برطانیہ

گرد چلتے پھرتے افراد ہیں۔ اُن کے چند شعر ملاحظہ کیجیے:

میری قسمت دیکھیے دو بول کہنے کے عوض ایک تھیں مس و مسز صفدر علی خاں ہوگئیں

کیا تم نے کبھی کوئی شرارت نہیں کی ہے
بچوں کو بُرا کہتے ہو اچھا مرے آگے

انشا صاحب اپنے اشعار میں خوب صورت محاورے اور ضرب الامثال پرونا خوب جانتے ہیں۔ یہ شعر دیکھیے:

بھوکے سوتے ہیں بیس فی صد لوگ تم نہ مانو مگر حقیقت ہے

مینا بازار جا کے دیکھو تو زندگی کتنی خوب صورت ہے

''غریبوں کے فلیٹ'' کے عنوان سے کہتے ہیں:

ایک وہ تاج محل جس میں فقط دو ہی نفس سیکڑوں ہم کہ فلیٹوں میں ہیں مانندِ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر ہم غریبوں کے فلیٹوں کا اُڑایا ہے مذاق

''جدیدیت'' کے عنوان سے فرماتے ہیں:

سنگ باری کی سزا کا تو سزاوار نہیں اتنی تکلیف تو مت دو مرے مستانے کو
ہاں جو ٹی ٹی سے اُڑا دے تو اُڑا دے اُس کو ''کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو''

کئی جگہ انشا صاحب نے کچھ نئی تراکیب بھی تراشی ہیں۔ مثلاً:

اک دانا نے اک دانا سے دو جملے بولے رمی سے
طوطے بھی پریشاں ہیں اب تو انساں کی انشاں چشمی سے

کبھی کبھی انشا صاحب، صاحبانِ اقتدار سے کس سادگی سے شکوہ کرتے نظر آتے ہیں:

ذرا سا اسپرے کروا دو ناظم
مری بستی میں مچھر ہوگئے ہیں

صفدر علی خاں انشا صاحبِ مطالعہ آدمی ہیں۔ اُنھیں زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ اسی لیے وہ مشتاق احمد یوسفی کی طرح جگہ جگہ اپنی حرف شناسی کا مظاہرہ کرتے ہیں:

یوں ہی گر انشا غزل پڑھتے رہے کچھ دیر میں دیکھنا ان کرسیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

تم نہ مانو مگر حقیقت ہے مال انسان کی ضرورت ہے

روز دس بیس مارے جاتے ہیں کیسی اعلیٰ تری قیادت ہے

انشا صاحب کی تخلیق ''آ بیل مجھے مار'' اردو طنز و مزاح میں خاصے کی چیز ہے۔ انشا صاحب ہمارے معاشرے میں آنسو پی کر قہقہے بانٹنے کا جہاد کر رہے ہیں۔ خدا کرے وہ اسی طرح لطافتوں کے گُل کھلاتے رہیں۔ ہم اُن کی نذر اپنے دو قطعات لکھ کر مضمون ختم کرتے ہیں:

رہینِ فکر و نظر شہریارِ ملکِ قلم لکھو کہ نوکِ قلم زندگی سنوارتی ہے
نشاطِ آبلہ پائی سے چُور ہم سفرو چلو کہ راہِ طلب آج بھی پکارتی ہے

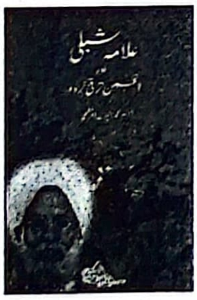
اکبرؔ ثانی

شعر میں جس طرح الفاظ پرو دیتے ہیں ان کا یہ فن ہے جسے گنجِ معانی کہیے
طنز میں خاص ہیں یہ اور مزاح میں ممتاز بھائی انشاؔ کو تو اب اکبرؔ ثانی کہیے

علامہ شبلی

اور

انجمن ترقیِ اردو



ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

قیمت: ۸۰۰ روپے

انجمن ترقیِ اردو پاکستان، ایس ٹی ۱۰، بلاک ۱، گلستانِ جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی

طفیل احمد مصباحی ❁

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C, Latifabad, Hyderabad

الطاف حسین حالی کی کتاب ''مولود شریف'' پر ایک نظر

ادبی دنیا میں خواجہ الطاف حسین حالی (وفات: دسمبر ۱۹۱۴ء) کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ نظم و نثر تحقیق و تنقید اور سوانح نگاری کے میدان میں ان کے کارنامے بے حد اہم ہیں۔ سر سید احمد خان (بانی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی) مرزا غالب نواب مصطفیٰ خان شیفتہ اور شبلی نعمانی کے احباب اور فیض یافتگان میں سے تھے۔ وہ غالب کو اپنا استاد مانتے تھے۔ اردو شاعری پر ان کی کڑی تنقید نے شعرا کو اپنی سمتِ قبلہ بدلنے پر مجبور کیا۔ ''مقدمہ شعر و شاعری'' ان کی تنقیدی مہارت و بصیرت کی آئینہ دار ہے۔ حالی نے اپنی مشہور مثنوی ''مدوجزرِ اسلام'' سرسید کی تحریک پر لکھی تھی جس نے علمی و ادبی حلقوں میں کافی شہرت حاصل کی۔ سرسید کہتے تھے کہ ''اگر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مجھ سے پوچھے گا کہ کیا لائے ہو تو حالی کی یہ مثنوی پیش کر دوں گا۔'' حالی تنقید اور سوانح کے بنیاد گزاروں میں سے ہیں۔ حالی کی ادبی عظمت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ ان کا شمار ''اردو ادب کے عناصرِ خمسہ'' میں ہوتا ہے جن کے نام یہ ہیں: میں سر سید، حالی، نذیر احمد، شبلی نعمانی محمد حسین آزاد۔ کہا جاتا ہے کہ اگر حالی نے ''یادگارِ غالب'' اور ''حیاتِ جاوید'' نہ لکھی ہوتی تو غالب اور سر سید آج پردۂ گمنامی میں پڑے ہوتے یا انھیں وہ مقام حاصل نہ ہوتا جو آج حاصل ہے۔ حالی خاموش طبیعت صوفی منش اور سنجیدہ مزاج انسان تھے۔ اسلام کے شیدائی اور حضور نبی کریم ﷺ کے سچے عاشق تھے۔ نعت گو شاعر کی حیثیت سے بھی ان کی ایک منفرد شناخت ہے۔ انھوں نے امتِ مسلمہ کی بے کسی اور زبوں حالی پر جس انداز سے جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں فریاد و استغاثہ پیش کیا ہے اس سے ان کی حضور علیہ السلام سے گہری عقیدت اور قلبی وابستگی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ حالی ایک قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ غزل و نظم کی طرح ان کی نعتیہ شاعری بھی خاصے کی چیز ہے۔ ''حالی کی نعتیہ شاعری'' کے عنوان پر ڈاکٹر تقی عابدی (کینیڈا) کی تحقیقی کتاب منظرِ عام پر آ چکی ہے۔ حالی کے مندرجہ نعتیہ کلام کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ آج بھی محفلِ میلادِ مصطفیٰ ﷺ میں آپ کا یہ گراں قدر نعتیہ کلام ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا — وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ — یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ
خطاکار سے در گزر کرنے والا — بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا

❁ سجان پور، کٹوریہ، تھانا عمر پور ضلع بانکا، بہار، ہندوستان۔ برقی پتا: tufailmisbahi@gmail.com

مفاسد کو زیر و زبر کرنے والا قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا
مسِ خام کو جس نے کندن بنایا کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا

نظم اور نثر دونوں میدان میں آپ نے اپنی صلاحیتوں کے جلوے بکھیرے ہیں۔ شاعری سے زیادہ نثر نگاری میں آپ نے نام پیدا کیا ہے اور گراں قدر علمی و ادبی سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔ ''مقدمۂ شعر و شاعری'' اور ''یادگارِ غالب'' کی تصنیف نے آپ کو غیر معمولی شہرت بخشی۔ ''حیاتِ سعدی'' بھی آپ کی ایک بلند پایہ نثری تصنیف ہے جس میں فارسی زبان کے مشہور شاعر معلمِ اخلاق، مصلحِ امت، عظیم فارسی نعت گو حضرت شیخ سعدی شیرازی علیہ الرحمہ کے احوال و معارف اور ان کی حیات و خدمات پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اردو دنیا کو اس عظیم المرتبت ہستی سے روشناس کرایا ہے۔ حالی کا یہ ایک عظیم کارنامہ ہے۔ حالی کی نثر نگاری اور ان نثری تصانیف پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر نور الحسن نقوی لکھتے ہیں:

> اردو نثر کے فروغ میں مولانا الطاف حسین حالی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ صحت کی خرابی کے باوجود وہ برابر لکھتے رہے اور نہایت توجہ کے ساتھ لکھتے رہے۔ وہ بہت اچھے شاعر بھی تھے اور بلند پایہ نثر نگار بھی لیکن شاعری پر ان کی نثر کا پلّہ بھاری ہے۔ حالی کی نثر نگاری کا آغاز ۱۸۶۷ء سے ہوا۔ سب سے پہلے انھوں نے مذہب سے متعلق ایک کتاب (مولود شریف جس کا تعارف و تبصرہ یہاں مقصود ہے) لکھی جس نے زیادہ شہرت نہیں پائی۔ ان کی پہلی اہم نثری تصنیف ''مجالس النساء'' ہے۔ یہ عورتوں کی تعلیم سے متعلق ہے لیکن انداز ناول کا ہے۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے سوانح نگاری اور تنقید کی طرف توجہ کی۔ ''حیاتِ سعدی'' لکھ کر انھوں نے اردو میں سوانح نگاری کا باقاعدہ آغاز کیا۔ واقعات کے سلسلے میں انھوں نے چھان بین سے کام لیا اور سائنٹفک انداز میں ایک عظیم فارسی شاعر (حضرت شیخ سعدی شیرازی) کے مستند حالات پیش کر دیے۔ یہ کتاب ۱۸۸۲ء میں لکھی گئی۔ ''یادگارِ غالب'' مولانا کے قلم سے لکھی گئی دوسری کتاب ہے جسے غالب شناسی کی سمت میں پہلا قدم کہنا چاہیے۔ اس سے مولانا کی غالب فہمی کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ البتہ درست ہے کہ غالب کی کمزوریوں کو وہ چھپا جاتے ہیں۔ ایک تو ان کا مزاج عیب جوئی کا نہ تھا، دوسرے غالب کو وہ اپنا استاد مانتے تھے۔ ''حیاتِ جاوید'' سرسید کی ضخیم اور مبسوط سوانح عمری ہے۔ مولانا حالی نے اس پر بہت محنت کی، مواد کی فراہمی کے لیے بار بار علی گڑھ آئے اور کافی دنوں یہاں مقیم رہے۔ انداز یہاں بھی وہی ہے کہ صاحب سوانح کی خامیوں پر اکثر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ اسی لیے شبلی اس کتاب کو طنز سے ''مدلل مداحی'' اور کتاب المناقب (یعنی تعریفوں سے لبریز کتاب) کہتے تھے۔ شبلی کی یہ سخت تنقید ''حیاتِ جاوید'' کی اہمیت اور افادیت کو گھٹا نہیں سکی۔ مولانا حالی کی سب سے اہم تصنیف ''مقدمۂ شعر و شاعری'' ہے۔ یہ ان کے مجموعۂ نظم کا مقدمہ ہے لیکن اب ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں شاعری کے اصول زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔ پروفیسر آل

احمد سرور نے اسے ''اردو شاعری کا پہلا مینی فیسٹو'' (منشور) کہا ہے۔ (''تاریخِ ادبِ اردو، ص ۲۹۳۔۲۹۴، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ)

الطاف حسین حالی کی شعری و ادبی خدمات اور ان کے علمی و قلمی رُشحات پر آج کا ادبی طبقہ جان چھڑکتا ہے اور قلمِ حالی سے نکلنے والے ایک ایک جملے کی تائید و توثیق کرتا ہے۔ حالی اس پایہ کے ادیب و شاعر ہیں کہ ان کی کتابیں جامعات کے نصاب میں شامل ہیں۔ لوگ ان کے تنقیدی افکار و نظریات کو دلیل اور حوالے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ حالی کی بلند پایہ تصنیف ''مقدمۂ شعر و شاعری'' اردو ادب اور بالخصوص اردو تنقید کی معتمد اور مستند ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ آج کے ادبا و شعرا اور محققین و ناقدین کی زبانوں پر غالب سر سید حالی، شبلی آزاد اور اقبال وغیرہ کے چرچے عام ہیں۔ کیوں کہ ان حضرات نے اردو ادب کی بیش قیمت خدمات انجام دی ہیں۔

''مولود شریف'' حالی کی پہلی تصنیف

اردو ادب کی نثری تاریخ میں ''میلاد نامہ'' یا ''مولود شریف'' لکھنے کی روایت قدیم ہے۔ اگر اس عنوان پر تحقیق کی جائے تو میلاد شریف کے موضوع پر سینکڑوں اردو کتابوں کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ ''میلادِ اکبر''، ''میلادِ گوہر''، ''تحفۃ الرسول'' (مولانا معین الدین آروی)، ''میلاد نامہ'' (شیخ عبدالفتاح گلشن آبادی)، ''رسول بیتی'' (خواجہ حسن نظامی)، ''میلادِ اکبر'' (شاہ اکبر داناپوری) وغیرہم درجنوں میلادی کتابیں اس وقت مارکیٹ میں دستیاب ہیں۔ زبان و بیان اور ادبی چاشنی سے لبریز عاشقِ مولانا معین الدین آروی کی کتاب ''تحفۃ الرسول'' لاجواب اور بےنظیر ہے اور راقم الحروف کے گاؤں میں محفلِ میلاد میں بڑے شوق و رغبت سے پڑھی جاتی ہے۔ ''مولود شریف'' حالی کی پہلی تصنیف ہے جو آج سے ایک سو چار سال قبل ۱۳۴۲ھ میں پہلی بار حالی پریس، پانی پت سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب اردو کے چند اہم میلاد ناموں میں سے ایک ہے۔

ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی (شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی) مولود شریف کا تعارف پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: حالی کی تصانیف میں ''مولود شریف'' زیادہ معروف نہیں ہے۔ ان کی تصانیف کے ذیل میں اس کا تذکرہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ بہت کم حضرات نے اسے سنجیدگی سے پڑھنے کی زحمت گوارا کی ہوگی۔ یہی سبب ہے کہ یہ تصنیف تقریباً گمنام رہی اور اس کے بارے میں کہیں مفصل اور تشفی بخش معلومات بھی دستیاب نہیں ہوئیں۔ راقم الحروف کو حالی کی نثری خدمات پر پی ایچ ڈی کا مقالہ ترتیب دینے کے دوران اس کے مطالعے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ کتاب حالی کے صاحب زادے خواجہ سجاد حسین نے اولاً حالی پریس، پانی پت سے اپنے تعارفی کلمات کے ساتھ ۱۹۳۲ء میں شائع کروائی۔ ان کے بقول انھیں حالی کا اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا اس کتاب کا مسودہ ہاتھ آ گیا اور اسی کی بنیاد پر ''مولود شریف'' کی اشاعت عمل میں آئی۔ یہی خطی نسخہ بعد میں محمد اسماعیل پانی پتی کا مملوکہ نسخہ بنا۔ میں نے اپنے مذکورہ مقالے میں اس کتاب کا اجمالاً تعارف پیش کیا ہے۔ میری نظر میں یہ حالی کی اولین نثری تصنیف ہے اور ان کی ابتدائی کوشش ہونے کے باوجود ان کی نثری تصانیف میں اس کی اہمیت ہے اور اسے نظر انداز کر کے حالی کے ذہنی و ادبی نشو و نما کا واضح شعور حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ حالی کی نثری کاوش کا یہ نقشِ اول ہے۔ اس سے ان کی ادبی شخصیت کی کونپلیں پھوٹیں بعد ازاں جس نے ایک تناور

درخت کی شکل اختیار کر لی۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو حالیؔ کے فکر وفن کے باب میں ''مولود شریف'' کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔ ''مولود شریف'' میں آیاتِ قرآنی و احادیث کے جا بجا حوالے دیے گئے ہیں۔ نیز تلمیحات کا استعمال بکثرت ہوا ہے۔ اس کے علاوہ عربی و فارسی اشعار بھی اچھی خاصی تعداد میں بنیادی متن کے جز و بن گئے ہیں۔ مشکل اور نامانوس الفاظ نیز اصطلاحات کی تعداد بھی کافی ہے جن کے مفہوم و معنی تک رسائی نسبتاً آسان نہیں۔'' (ابتدائیہ ''مولود شریف''، ص ۱۰۹، ثمر آفسیٹ پرنٹرس، دہلی تقسیم کار: انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی)

اگر چہ ''مولود شریف'' حالیؔ کی ایک میلادی کتاب ہے لیکن انھوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فضائل و کمالات اور محاسن و مناقب کو جس عقیدت و وارفتگی کے ساتھ بیان کیا ہے وہ قابلِ دید اور لائقِ مطالعہ ہے۔

حالیؔ نے اپنی ''مولود شریف'' میں فضیلتِ میلاد اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فضائل و کمالات امتیازات و خصوصیات عادات و خصائل اور اخلاقِ حسنہ کا ذکر بڑے دل پذیر انداز میں کیا ہے اور اس سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رحمت و شفقت، عفو و درگزر، خُلق و سیرت، عظمت و شوکت، شفاعت اور معجزات و خوارق کا ذکر خصوصی طور پر کیا ہے۔ آخر میں حالیؔ نے مسلمانوں کو تلقین کی ہے کہ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور سیرتِ طیبہ کی پیروی کریں۔



لُولُوئے از غیب

شِولال

مرتبہ: ڈاکٹر محمد ایوب قادری

قیمت: ۱۰۰ روپے



تلخیصِ معلّٰی

مؤلفہ: کلب حسین

مرتبہ: ڈاکٹر انصار اللہ نظر

قیمت: ۱۰۰ روپے

انجمن ترقیِ اردو پاکستان، ایس ٹی ۱۰، بلاک ا، گلستانِ جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی

رئیس صدیقی ❁

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C, Latifabad, Hyderabad.

پہلی ہندوستانی جنگِ آزادی کی عظیم خاتون مجاہد اودھ کی ملکہ بیگم حضرت محل

بیگم حضرت محل، انھیں بیگم اودھ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ وہ ہندوستان کی، خاص طور سے اودھ کی پہلی اور عظیم خاتون مجاہد آزادی اور برطانوی سلطنت کے ظلم و جبر کے خلاف خاتون جنگ جوؤں میں سے ایک دلیر انقلابی خاتون تھیں۔ بیگم نے ۱۸۵۷ء میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف ہندوستان کی پہلی تحریکِ آزادی میں شامل ہو کر اودھ، خاص طور پر لکھنؤ میں جنگی قیادت سنبھالی۔ اس دلیر اور بہادر خاتون نے ہندوستانی تاریخ میں پہلی جنگ آزادی کی واحد عظیم جنگ جو خاتون رہنما کے طور پر اپنا ناقابلِ فراموش کردار درج کیا۔ بیگم نے زندگی بھر برطانوی سامراج کے خلاف سیاسی اور جنگی مزاحمت جاری رکھی۔

۱۸۲۰ء میں وہ فیض آباد میں پیدا ہوئیں۔ ان کا نام محمدی خانم رکھا گیا۔ وہ فیض آباد (اودھ، اتر پردیش) کے ایک غریب سیّد گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ بچپن میں ان کے والدین نے اپنی غربت کی وجہ سے نواب محل کے دلالوں کے ہاتھ انھیں بیچ دیا۔ جلد ہی انھوں نے اپنے فن رقص کی وجہ سے شاہی دربار میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا اور شاہی حرم میں شامل کر لی گئیں۔ کچھ دنوں بعد، انھیں پری اور پھر مہک پری خطاب مل گیا اور ایک دن وہ اودھ کے بادشاہ، آخری تاجدار اودھ، واجد علی شاہ کی بیگم بن گئیں۔ ان کے بیٹے، اودھ کے شاہی وارث، برجیس قدر کی پیدائش کے بعد انھیں حضرت محل کے لقب سے نوازا گیا۔

۱۸۵۶ء میں، برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ریاست اودھ پر اپنا کنٹرول حاصل کر لیا اور نواب واجد علی شاہ کو کلکتہ میں جلا وطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا۔ دراصل مغل اور انگریزوں کے درمیان ایک جنگی معرکہ میں اودھ کی فوج نے مغل فوج کے ساتھ مل کر مقابلہ کیا تھا۔ اس جنگ میں گورے جیت گئے اور تب سے گوروں کے نشانے پر اودھ بھی شامل ہو گیا۔ موقع ملتے ہی انگریزوں نے اپنی شاطرانہ سازشوں سے اودھ پر فوجی قبضہ کر لیا۔ بیگم حضرت محل نے اس فیصلے کی مخالفت کی لیکن ان کی ایک نہ چلی اور واجد علی شاہ کو اودھ چھوڑ کر کلکتہ میں جلا وطنی کی زندگی گزارنی پڑی۔ لیکن بیگم اودھ نے انگریزوں کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا اور خود اپنی سیاسی اور مسلح جدوجہد سے اودھ پر دوبارہ کنٹرول حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔

جیسے ہی ۱۸۵۷ء میں پہلی ہندوستانی تحریک آزادی شروع ہوئی، بیگم نے اپنے بیٹے شہزادہ برجیس قدر کو ولی، اودھ کا حکمراں

❁ بنگلہ نمبر ۲، راحت کدہ، ۱۴ رگرین ویلی انکلیو، ایئرپورٹ روڈ، بھوپال، ہندوستان۔ برقی پتا: rais.siddiqui.ibs@gmail.com

بنا دیا اور خود رانی ماں کے طور پر اودھ کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔ لکھنؤ میں اپنے بیٹے کے ساتھ، بیگم نے ریاست اودھ کے امور کی ذمے داری سنبھالنے کے ساتھ ساتھ اپنے انقلابی فوجی دستے کی قیادت بھی انجام دی۔

۱۸۵۷ء کی پہلی ہندوستانی تحریک آزادی کے دوران، بیگم کی گوروں سے دو بنیادی شکایات تھیں۔ مسجدوں اور مندروں کی بے حرمتی، وہ بھی صرف سڑکیں ہموار کرنے کے لیے۔ اس کے علاوہ، کارتوسوں میں سؤروں اور گایوں کی ہڈیاں استعمال کرنا بھی مذہبی طور پر ناقابلِ برداشت عمل تھا۔ بیگم حضرت محل نے اودھ کے دیہی باشندوں سے اپیل کی اور انھیں اس آزادی کی لڑائی میں شامل ہونے کی ترغیب دی۔ یہاں تک کہ بیگم نے اپنی ساری دولت اودھ کے باشندوں کے درمیان بانٹ دی۔ یہ رقم ان ایک لاکھ لوگوں کے درمیان تقسیم کی جو اودھ کی وفاداری کے ساتھ انگریزوں کے خلاف لڑنے اور اودھ پر دوبارہ قبضہ حاصل کرنے میں مدد کے لیے پرعزم تھے۔ ان انقلابیوں نے بڑی وفاداری اور بہادری سے انگریزوں سے مقابلہ کیا اور اودھ و لکھنؤ پر دوبارہ قبضہ حاصل کر لیا۔ بیگم حضرت محل اس آزادی کی جدوجہد میں کامیاب سپہ سالار ثابت ہوئیں اور ۵/ جولائی ۱۸۵۷ء کو، بیگم حضرت محل نے اس شان دار فتح کے ساتھ لکھنؤ میں اودھ کی حکومت کو ایک بار پھر حاصل کر کے اپنے ۱۴ سالہ بیٹے کے حوالے کر دیا۔

لیکن ۱۶/ مارچ ۱۸۵۸ء کو جب برطانوی فوجیں دلی سے گوروں کی مدد کے لیے لکھنؤ پہنچی تو بیگم نے لکھنؤ اور اودھ کے بیشتر حصے پر اپنا کنٹرول کھو دیا۔ وہ اپنی فوج کے ساتھ پیچھے ہٹ گئیں لیکن اس پسپائی کے باوجود، بیگم حضرت محل دوسرے خفیہ ٹھکانوں پر اپنے انقلابی فوجی دستے کو از سرِ نو منظم کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔

بالآخر، ۱۸۵۹ء کے آخر تک، ترائی میں ایک مختصر رہائشی قیام کے بعد، بیگم اودھ کو نیپال ہجرت کرنا پڑی جہاں وزیرِاعظم جنگ بہادر نے پہلے تو پناہ دینے سے انکار کر دیا لیکن بعد میں، برطانوی حکومت کے اس مطالبے کے باوجود کہ بیگم کو ان کے حوالہ کر دیا جائے، حضرت محل کو سیاسی پناہ مل گئی۔

کچھ عرصے بعد، انگریزوں نے بیگم کو اودھ واپس آنے اور ان کے ماتحت کام کرنے کے لیے بھاری پنشن کی پیشکش کی لیکن بیگم نے اسے ٹھکرا دیا اور اپنی آخری سانس تک برطانوی حکومت کے خلاف انقلابی مزاحمت جاری رکھی۔ ان کا انتقال ۵۹ سال کی عمر میں، ۷/ اپریل ۱۸۷۹ء کو کھٹمنڈو، نیپال میں ہوا۔ بیگم حضرت محل کے مجاہدانہ کردار نے انھیں برطانوی سامراج کے خلاف پہلی ہندوستانی تحریک آزادی کی تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک عظیم خاتون مسلح انقلابی ہیرو کا درجہ دے دیا۔

بیگم کی موت کے بعد، ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کے موقعے پر، برطانوی حکومت نے برجیس قدر کو معاف کر دیا اور انھیں گھر واپس آنے کی اجازت دے دی۔

بیگم حضرت محل کا مقبرہ جامع مسجد کے قریب کھٹمنڈو کے مرکزی پارک میں واقع ہے۔ مسجد اور اس کی دیکھ بھال جامع مسجد کمیٹی کرتی ہے۔

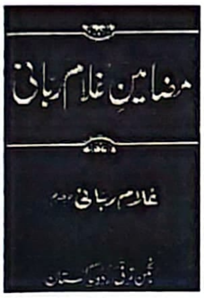
۱۵/ اگست ۱۹۶۲ء کو بیگم حضرت محل کو حضرت گنج، لکھنؤ کے پرانے وکٹوریہ پارک میں ''۱۸۵۷ء کی پہلی ہندوستانی تحریکِ آزادی میں بیگم کے مثالی انقلابی کردار'' کو تسلیم کرتے ہوئے اعزاز سے نوازا گیا۔ پارک کے ساتھ ہی ایک سنگِ مرمر کی یادگار بھی تعمیر

کی گئی جس میں اودھ شاہی خاندان کی اہم نشانیوں پر بنی پیتل کی چار گول تختیوں کے ساتھ سنگِ مرمر کا کتبہ بھی شامل ہے۔

۱۰ رمئی ۱۹۸۴ء کو حکومت ہند نے بیگم حضرت محل کے اعزاز میں ایک یادگاری ڈاک ٹکٹ جاری کیا اور ہندوستانی اقلیتی امور کی وزارت نے اقلیتی برادریوں سے تعلق رکھنے والی ہونہار لڑکیوں کے لیے بیگم حضرت محل نیشنل اسکالرشپ شروع کی۔ اس اسکالرشپ کو مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے ذریعے لاگو کیا گیا تھا۔

بیگم حضرت محل ہم سب کے لیے ایک عظیم مثالی مجاہد آزادی تھیں کیوں کہ بیگم نے دنیا کے سب سے بڑے طاقت ور نوآبادکار، برطانوی سامراج کا تنہا مقابلہ کیا۔ اتنا ہی نہیں، انھوں نے عدم مساوات اور ناانصافی کے خلاف آواز بھی بلند کی۔ وہ مذہبی رواداری اور دوستی کی علامت کے طور پر بھی کام کرتی رہیں۔ وہ اپنے وقت کی قومی یک جہتی، آپسی میل جول اور گنگا جمنی تہذیب کی علم بردار تھیں۔

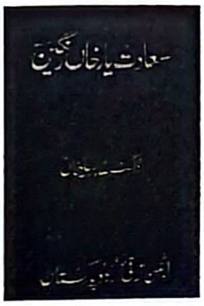
ہم سب اہلِ وطن کی طرف سے انھیں دل کی گہرائیوں سے ہزاروں سلام!



مضامینِ غلام ربانی

غلام ربانی

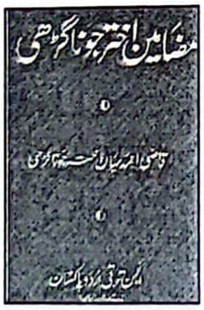
قیمت: ۴۰۰ روپے



سعادت یار خاں رنگین

ڈاکٹر صابر علی خاں

قیمت: ۵۰۰ روپے



مضامینِ اختر جونا گڑھی

قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی

قیمت: ۳۰۰ روپے

انجمن ترقیِ اردو پاکستان، ایس ٹی ۱۰، بلاک ۱، گلستانِ جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی

رئیس احمد کمار ❁

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C, Latifabad, Hyderabad.

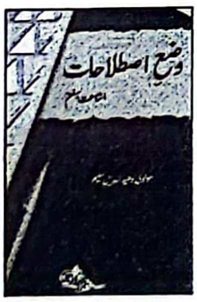
''نگینہ'' انٹرنیشنل کا سال نامہ (جولائی تا دسمبر ۲۰۲۴ء)

جموں و کشمیر میں اردو زبان و ادب کو معیار بخشنے اور اسے فروغ دینے میں جن ادبی رسالوں نے کلیدی اور مخلصانہ کردار نبھایا ہے، ان میں ''نگینہ'' انٹرنیشنل کا نام سرفہرست ہے اور سنہرے حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔ کئی دہائیوں سے مسلسل چھپنے والا یہ رسالہ نہ صرف تجربہ کار ادبا کو ہی بلکہ نوآموز قلم کاروں کی نگارشات کو جگہ فراہم کرکے یہ عندیہ دیتا ہے کہ ''نگینہ'' انٹرنیشنل ادبی خدمات انجام دینے میں کسی قسم کا امتیاز نہیں برتتا ہے۔ سال نامہ جولائی تا دسمبر ۲۰۲۴ء، ''نگینہ'' انٹرنیشنل نے خصوصی شمارے کے تحت شائع کیا ہے۔ اس میں مرحوم عبدالغنی شیخ لداخی کی حیات اور ادبی زندگی و کارناموں پر مختلف ادبا کے کالم، تبصرے اور مضامین شامل خدمت کرکے خطہ لداخ کی اس طاقتور اور معیاری افسانوی آواز کو اچھے الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کی بہترین کوشش کی گئی ہے۔ شمارے کا اداریہ ''بات سے بات'' جناب وحشی سعید صاحب نے لکھا ہے جو اس رسالے کے مدیر بھی ہیں۔ اداریے میں کتابوں کی اہمیت، موجودہ دور میں کتب بینی کی صورتحال اور حال ہی میں سری نگر میں منعقد ہونے والے چنار کتابی میلہ کے حوالے سے بھی بات ہوئی ہے۔ اشرف عادل اور عالم بنارسی کے حمدیہ اور نعتیہ کلام کے بعد عشاق کشتواڑی نے مرحوم عبدالغنی شیخ کو ایک نظم کی صورت میں اپنا خراج پیش کیا ہے۔ گفتگو بند نہ ہو، سلیم سالک کا شیخ عبدالغنی لداخی سے لیا گیا انٹرویو بھی اس خاص شمارے میں شامل کیا گیا ہے۔ گفتگو کے دوران معلوم ہوتا ہے کہ شیخ عبدالغنی لداخی نے ساتویں جماعت سے ہی لکھنا شروع کیا ہے جب ان کا ایک لطیفہ ''پیامِ تعلیم'' مکتبہ جامعہ، دہلی کے رسالے میں شائع ہوا تھا۔ بعدازاں ان کی نگارشات ''شمع'' اور ''بانو'' میں بھی شائع ہوئیں۔ ان کی متعدد کہانیوں کا دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا ہے جو ملکی اور عالمی سطح پر کافی پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔ شیخ عبدالغنی لداخی نام ہی کافی ہے، خصوصی شمارے میں شائع ہوا یہ مفصل و مدلل مضمون انجینئر شفیع احمد نے قلم بند کیا ہے۔ موصوف نے شیخ صاحب کے ساتھ لداخ میں ہوئی پہلی ملاقات کو بھی مضمون کا حصہ بنایا ہے اور کہتے ہیں کہ شیخ صاحب ایک قدآور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ فہم و فراست کے بھی مالک تھے۔ ان کا مزید کہنا ہے کہ شیخ صاحب ایک متحرک ادیب تھے اور وہ مختلف ممالک میں گھوم کر کئی سفرنامے بھی لکھ چکے ہیں۔ مرحوم شیخ عبدالغنی لداخی نے نامور ادیب اور قلم کار نور شاہ صاحب کو ایک خط ارسال کیا تھا جس میں درخواست کی گئی تھی کہ ان کے چار افسانچے ''نگینہ'' انٹرنیشنل کے اگلے شمارے میں شامل کیے جائیں۔ مرحوم کی فرمائش کو عملی جامہ پہنا کر ''نگینہ'' انٹرنیشنل کے اس خصوصی شمارے میں بالآخر جگہ دی گئی۔ یہ افسانچے نالائق، میں نہ مانوں، عقل مند کو اشارہ کافی ہے اور انھیں ولی کہوں یا درویش، قابلِ ذکر ہیں۔ عبدالغنی شیخ لداخی کی کہانیوں

❁ قاضی گنڈ، جموں و کشمیر۔ برقی پتا: rayeeskumar31@gmail.com

میں لداخ، عبدالرشید راہگیر لداخی کا یہ طویل اور جان دار وشان دار مضمون عبدالغنی شیخ کی زندگی اور کارناموں کا اچھی طرح احاطہ کرتا ہے۔ موصوف کے مطابق اکبر لداخی کے بعد شیخ عبدالغنی ہی لداخ کے دوسرے بڑے افسانہ نگار ہونے کی حیثیت رکھتے ہیں جبکہ لداخ کا پہلا ناول نگار ہونے کا سہرا شیخ صاحب کے سر ہی جاتا ہے۔ عبدالرشید راہگیر نے شیخ عبدالغنی لداخی کے تمام افسانوی مجموعوں جیسے ''زوجیلا کے آر پار''، ''دوراہا''، The Parsaking Paradise، ''دو ملک ایک کہانی'' پر اور ''وہ زمانہ'' اور ''دل ہی تو ہے'' ناولوں پر مختصر مگر جامع کلمات تحریر کر کے ان کے ادبی قد کا احاطہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ بقول رشید راہگیر عبدالغنی شیخ کی اکثر کہانیوں میں لداخ کی تاریخ، رہن سہن، کلچر اور لداخ کا پس منظر کہیں نہ کہیں نظر آ ہی جاتا ہے۔ شیخ عبدالغنی کے ایک افسانے ''ہوا'' کا تجزیاتی مطالعہ بھی قارئین اس شمارے میں ملاحظہ کر سکتے ہیں جو مشہور شاعر و افسانہ نگار پرویز مانوس نے لکھا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں کہ ہوا کو علامت کے طور پر استعمال کر کے مصنف نے فن کارانہ انداز میں دکھا دیا ہے کہ کس طرح ایک پُرسکون گاؤں میں مذہبی اور سیاسی اختلافات کے باعث نفرت اور ظلم کے طوفان بدامنی کا باعث بنتے ہیں اور انسانیت بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ ''رنگ لالہ زار کے''، افسانوی دنیا کے شہنشاہ نور شاہ صاحب نے اس تحریر میں نہ صرف شیخ عبدالغنی لداخی کا تعارف پیش کیا ہے بلکہ ان پر انھیں اس لیے فخر محسوس ہو رہا ہے کہ لداخ جیسے برفیلے اور دور دراز علاقے کی بکھری ہوئی زندگی کو اپنے منفرد انداز میں کہانیوں میں سمیٹ لیتے ہیں۔ نور شاہ کا مزید کہنا ہے کہ شیخ عبدالغنی ایک خاموش سمندر تھے اس سمندر کو قلم کی قوت سے کاغذ پر بکھیرنا انھیں خوب آتا تھا۔ وحشی سعید ادب، محبت اور سفر ایک جائزہ، روزنامہ ''تعمیلِ ارشاد'' کے مدیر جناب ناظم نذیر صاحب کا یہ طویل، پُرمغز اور شان دار مضمون وحشی سعید صاحب کی زندگی، ان کی ادبی خدمات اور ان کی شخصیت کے مختلف گوشوں پر تفصیلی روشنی ڈالتا ہے۔ بقول ناظم نذیر، وحشی سعید صاحب کے ادبی ذوق، فراخ دلی اور ادب نوازی کا ہر شخص معترف ہے۔ نوجوان انشائیہ نگار ایس معشوق کا انشائیہ ''جب ہم مبتلا ہوئے'' بھی اس شمارے کے مشمولات میں شامل ہے۔ ڈاکٹر احسان عالم کے دو بلکہ سراج زیبائی، ڈاکٹر پریمی رومانی، ڈاکٹر رؤف خیر اور ڈاکٹر علی عباس کے ایک ایک مضمون کو بھی اس خاص شمارے میں جگہ ملی ہے جن سے قارئین بخوبی استفادہ کر سکتے ہیں۔ منظومات کی بات کریں تو متعدد کہنہ مشق شعرائے کرام کے ساتھ ساتھ نوآموز شعرا کی تخلیقات کو بھی جگہ ملی ہے۔ رفیق راز، رخسانہ جبین، ڈاکٹر راشد، نذیر فتح پوری، استوتی اگروال، ظفر اقبال، محمد نعیم خان، مبارک لون وغیرہ وغیرہ کی تخلیقات اس میں شامل ہیں۔ ''آنندی'' اور ''اندر کی بات'' تنویر اختر رومانی کے دو افسانچے سماج میں جنم لینے والے ناسور کی نشاندہی کرتے ہیں اور ہماری گھریلو زندگی کس طرح متاثر ہوتی ہے مختصر کہانی کے ذریعے دکھایا گیا ہے۔ ارم رحمان کا افسانہ ''روشنی''، ایک علامتی افسانہ ہے جو روشنی کو بطورِ علامت استعمال کر کے انسانی سماج کو ایک گہرا اور نصیحت آموز سبق دینا چاہتا ہے۔ ''بدخاہ کشمیری کہانی''، انجینئر شفیع احمد کی یہ کہانی ماں باپ کی اپنے اولادوں کے تئیں ہمدردی اور اولادوں کی بے حسی اور غیر ذمے دارانہ طرزِ عمل کو اجاگر کرتا ہے۔ ''سچے پیار کی ادھوری کہانی'' ڈاکٹر رونق جمال کا رومانوی افسانہ ہے جو قاری کو متاثر کرتا ہے اور یہ کہانی بین المذاہب دلوں کی داستان سناتا ہے جو عمر کے آخری ایام تک ایک دوسرے کے سچے خیر خواہ اور وفادار نکلتے ہیں۔ ''ایکس وائی''، ڈاکٹر نذیر مشتاق اس افسانے کے ذریعے عورتوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی اور ناکردہ گناہوں کی سزا کا اصل قصوروار مرد کو اس لیے ٹھہراتا ہے کہ اسی کے خلیے میں ایکس اور وائی کروموسوم ہوتے ہیں۔ ''دلِ ناتواں''، فرخندہ ضمیر احمد

کا یہ افسانہ سماج میں پھیلتی بے حیائی اور بے پردگی کے نتائج کو ظاہر کرتا ہے کہ کس طرح عریانی اور نیم برہنہ کپڑوں میں ملبوس عورتوں کو ہوس پرست لوگ اندھیرے اور موقع کا فائدہ اٹھا کر اپنا شکار بناتے ہیں۔ ''مٹی کی خوشبو''، برصغیر کے ممتاز افسانہ نگار جناب نور شاہ صاحب کا افسانہ ان لوگوں کی داستان سنا رہا ہے جو کسی کام کے سلسلے میں وادی گل پوش سے باہر اپنے شب و روز گزارتے گزارتے اپنے آبائی وطن کو تقریباً بھول ہی جاتے ہیں، نتیجتاً وہ اپنی مٹی کی خوشبو سے بھی محروم ہوجاتے ہیں۔ حیدر کا اکلوتا بیٹا معصوم حادثے کا شکار ہوکر اس کی خواہش تو پوری ہوتی ہے مگر حیدر کو عمر بھر بیٹے کا غم ستاتا رہے گا کیوں کہ بقول اس کے، اس قدر جلدی بھی کیا تھی۔ مشتاق مہدی کا ڈراما ''انسان'' بھی رسالے میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ ''نگینہ'' انٹرنیشنل، ''سلوٹیں''، ''ٹوٹتی جڑتی زندگی'' اور ''مظفر حنفی: حیات و جہات'' جیسی تصنیفات پر تحریر کردہ تبصرے قارئین کے نظروں سے گزرتے ہیں۔ ''ادبی جھلکیاں''، نور شاہ صاحب نے سال ۲۰۲۴ء میں ''نگینہ'' انٹرنیشنل، فکشن رائٹرز گلڈ اور دیگر ادبی تنظیموں کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والی ادبی تقریبات کا تفصیلی خلاصہ اور جائزہ پیش کرتے ہوئے ان تقریبات میں مختلف کتابوں کی رسم رونمائی انجام دینے اور ادبا کو اعزازات نوازنے کی خبروں سے قارئین کو محظوظ کیا ہے۔ پروفیسر مخمور حسین بدخشی اور صابر دت کی حیات اور ادبی خدمات پر نور شاہ صاحب کے دو مضامین بھی اس رسالے میں شامل ہیں جو ان کے کارناموں اور گہری ادبی دلچسپی کا خوب صورتی سے احاطہ کرتے ہیں۔ آخر میں ''قندِ مکرر'' کے تحت پروفیسر حامدی کشمیری کا مضمون ''تخلیقی زبان کے مسائل''، عام فہم اور تخلیقی زبان میں فرق واضح کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی سلسلے کے تحت دوسرا مضمون ''مادری زبان اور خیال کا عمل'' گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ ادیب اور کہنہ مشق شاعر پروفیسر رحمان راہی کا ہے جو انھوں نے ۱۹۷۶ء میں تحریر کیا تھا۔ رسالے کے آخری صفحے پر بشیر نواز اور حکیم منظور کی دو غزلیں بھی قاری کے نظروں سے گزرتی ہیں۔



وضعِ اصطلاحات

(ساتویں اشاعت)

مولوی وحید الدین سلیم

قیمت: ۶۰۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ایس ٹی ۱۰، بلاک ۱، گلستانِ جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، کراچی

حافظ سراج الدین ❀

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C, Latifabad, Hyderabad.

مذہب، کلچر اور فنونِ لطیفہ: ایک مطالعہ

تہذیب اور ثقافت دونوں اپنی اپنی جگہ کُل ہیں، کسی کو دوسرے کا جزو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بعض مفکرین نے مذہب کو ثقافت کا سرچشمہ قرار دیا ہے اور سمجھتے ہیں کہ اگر ثقافت جسم ہے تو مذہب اس کی روح ہے۔ دین اسلام جائز حدود کے اندر رہ کر فنونِ لطیفہ کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ 'اسلام ایک حقیقت پسند دین ہے، جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں جسم، روح، عقل و وجدان سے بحث کرتا ہے کہ حدود و اعتدال میں رہتے ہوئے ان تمام کو غذا فراہم کی جائے۔'[(۱)] دنیا میں فنون کے ابتدائی نمونے مصوری، موسیقی، فنِ تعمیر اور سنگ تراشی نے فطرت اور انسان میں خوب صورتی کو تلاش کیا ہے۔

پیشِ نظر کتاب ''مذہب، کلچر اور فنونِ لطیفہ'' میں مذہب کا ثقافت اور فنونِ لطیفہ سے تصادم، اس کی نوعیت، ربط باہم کے مباحث، اسباب، نتائج کی دریافت اور انسان کے جمالیاتی احساس کی مادی و روحانی اظہار کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ فنونِ لطیفہ کے باب میں فنون کے ایک ایک فن کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے اور ہر فن کی مختلف جہتوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر احمد عبداللہ قمر ہیں، جن کا تعلق فتح پور لیہ سے ہے۔ پروفیسر احمد عبداللہ، گورنمنٹ کالج، کروڑ میں اردو کے استاد ہونے کے ساتھ شاعر اور ادیب بھی ہیں، جب کہ کلچر اور فنونِ لطیفہ سے فطری لگاؤ رکھتے ہیں۔ پنجابی ادب سے بھی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ ظلم، جبر اور معاشرے کے استحصال پر ان کی نظمیں بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ مصنف کی یہ کتاب ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے، جو ڈاکٹر غلام عباس گوندل کی زیرِ نگرانی جامعہ سرگودھا سے مکمل کیا۔ پروفیسر طارق گجر لکھتے ہیں: 'پروفیسر احمد عبداللہ نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے جس موضوع کو چنا، اس میں بھی مذہب، ثقافت اور فنونِ لطیفہ کے مباحث موجود ہیں، مگر ان کو اعزاز یہ ہے کہ انھوں نے ان مباحث کو روایتی سطح پر بیان کرنے کی بجائے ان کا عالمانہ سطح پر تجزیہ کیا ہے۔ میرے خیال میں نظری مباحث کے متعلق عالمانہ اندازِ بیان انھیں اپنے والدِ گرامی ڈاکٹر خورشید احمد آسی سے ورثے میں ملا ہے۔ وطنِ عزیز پاکستان میں پچھلے پچاس برس میں ادب، ثقافت اور فنونِ لطیفہ کو جس طرح مخصوص مذہبی نظریات کے ذریعے جامد رکھنے کی کوشش کی گئی، اس سے اہلِ نظر بخوبی واقف ہیں، ایسے میں ڈاکٹر احمد عبداللہ جیسے محققین کا دم غنیمت ہے کہ جو جمود کی گرفت میں آئے بغیر ماحول میں اپنے تحقیقی کام کے ذریعے علمی تحرک کے لیے کوشاں ہیں۔' ڈاکٹر احمد عبداللہ ایک منفرد اسلوب کے مالک ہیں، ان کے ہاں سادگی، شیرینی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اس مقالے کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اول مذہب، کلچر اور فنونِ لطیفہ: بنیادی مباحث، باب دوم مذہبی مباحث، باب سوم ثقافتی مباحث، باب چہارم فنونِ لطیفہ

❀ گورنمنٹ ہائی اسکول، راہداری، تحصیل نور پور تھل، ضلع خوشاب۔ فون: ۰۳۴۵-۵۸۵۰۲۳۲

اور باب پنجم محاکمہ پر مشتمل ہے۔

باب اول: 'مذہب، کلچر اور فنونِ لطیفہ: بنیادی مباحث' میں انسان اور مذہب کے حوالے سے سائنسی اور ارتقائی انداز نظر سے مختلف مفکرین کی روشنی میں واضح کیا گیا کہ مذہب انسانی زندگی کے عقائد وتصورات کے ساتھ سماجی پہلو کا بھی عکاس ہے۔ مذہب کی اقسام میں ارتقائی اور انقلابی مذاہب ہیں۔ مذہب کی غایت میں دو رویے بیان کیے، جن میں ایک مذہب: پوجا پاٹ کا نظام اور دوسرا مذہب: نظام حیات ہے۔ جب کہ مذہب معاشرے کی یک جہتی اور بقا کے لیے ضروری ہے۔ ان بنیادی مباحث میں مذہب کے جن موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے، ان میں مذہب کیا ہے، مذہب کی اقسام، مذہب کی غایت، تصورِ خدا اور مذہب، فعال اور غیر فعال خدا کا تصور، مذہب کی ابتدا اور ارتقا میں (لامذہبی، فیٹش پرستی، ٹوٹم پرستی، شامان پرستی، بت پرستی) اور مذہب کے انسانی زندگی پر اثرات شامل ہیں۔ مصنف صاحبزادہ عبدالرسول کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ مذہب معاشرے کی یک جہتی اور بقا کے لیے از بس ضروری ہے۔ بعض محققین کے نزدیک مغربی تہذیب کے ہاتھوں قدیم معاشروں کے ناپید ہونے کی وجہ سے ان کے ہاں مذہب کا فقدان ہے۔

تصورِ خدا اور مذہب میں، مذہب کو انسانی حیات کا اوڑھنا، بچھونا قرار دیا ہے۔ کیرن آرم سٹرانگ نے فلسفیوں، صوفیوں اور مصلحین کے تصورِ خدا، تمام مذاہب کے تصورِ خدا اور موجودہ روشن خیال مکتبہ فکر کے تصورِ خدا کو پیش کیا ہے۔ آرم سٹرانگ لکھتی ہیں: 'روشن خیالی کے عہد میں فلسفیوں نے خدا کے تصور کو مسترد نہیں کیا تھا، وہ اصل میں آرتھر وڈوکس کے ظالم خدا سے اکتا گئے تھے، جو انسان کو ابدی عذاب کی دھمکیاں دیتا تھا۔ لیکن حقیقت مطلق پر ان کا ایمان بدستور قائم تھا۔ والٹر نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر خدا موجود نہ ہوتا تو اسے ایجاد کر لینا بھی ممکن نہ ہوسکتا۔'[۲] مصنف نے فعال اور غیر فعال خدا کا تصور پیش کرتے ہوئے عقیدہ ڈی ازم پر گفتگو کی ہے۔ مذہب کی ابتدا اور ارتقائی سفر کو لامذہبی، فیٹش پرستی، ٹوٹم پرستی، شامان پرستی اور بت پرستی میں تقسیم کیا ہے اور مذہبی خدا کا تصور انسان کے ارتقائی سفر کے حوالے سے متعین کیا گیا ہے۔ علی عباس جلال پوری اور کچھ مغربی مفکرین کے خیال میں مذہب کا خاتمہ ہو جائے گا اور انسان نظریہ حیات پر اعتبار کرنے کے قابل ہو جائے گا، مگر مصنف دریا اور چشمے کی مثال دیتے ہوئے اپنا موقف بیان کرتا ہے کہ 'مذہب کبھی مرتا نہیں بلکہ ایک نئے نظریے کے روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے۔'

کلچر

بنیادی مباحث میں تہذیب اور ثقافت کی واضح حد فاصل مقرر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فیض احمد فیض تہذیب اور کلچر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: 'زندگی کو اگر ایک قطعہ اراضی سے تشبیہ دیں تو اس پر تعمیر ہونے والا مکان تہذیب ہوگا، جب کہ اس کی نقاشی تزئین و آرائش کو کلچر قرار دیا جا سکتا ہے۔'[۳] کلچر کی ابتدا، دنیا میں تہذیب کی ابتدا کے حوالے سے بیشتر مفکرین کا خیال ہے کہ زراعت کے آغاز سے ہی تہذیب کی ابتدا ہوئی اور انسان ابتدا ہی سے اپنے کلچر کا حامل ہے۔ 'انسان اور ثقافت کا ساتھ اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود انسان۔'

علماے تہذیب نے انسانی ثقافت کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ فریڈرک اینگلز نے تین ادوار عہدِ وحشت، عہدِ بربریت، تہذیب کا عہد اور سبطِ حسن نے چار ادوار ثمر یابی کا دور، شکار کا دور، گلہ بانی کا دور، زراعت کا آغاز، جب کہ سجاد ظہیر نے روشنائی میں سماج کو پانچ ادوار، قدیم اشتراکی سماج، غلامی، جاگیر داری، سرمایہ داری اور جدید اشتراکی سماج میں تقسیم کیا۔ کلچر کی بنیاد اور تہذیب و ثقافت کے اجزاے ترکیبی کو سبطِ حسن کے حوالے سے نئی اور پرانی تہذیب کے چار عناصر بیان کیے ہیں، جس میں طبعی حالات، آلات و اوزار، نظامِ فکر، احساس اور سماجی اقدار ہیں۔ کلچر کی اقسام، کلچر کی صورتیں اور کلچر کے محیط پر بات کرتے ہوئے مصنف نے فیض احمد فیض کی مثال دی ہے۔ 'فرض کریں کلچر ایک میز ہے، اس کی تین حدود ہیں۔ طول، عرض، گہرائی۔ ڈاکٹر احمد عبداللہ نے کلچر کے دائرے، قومی ثقافت کی شکلیں اور تہذیبی ثقافتی قبولیت پر تفصیل سے گفتگو کی ہے، جو سندی تحقیق کے حوالے سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔

فنونِ لطیفہ

'بنیادی مباحث' میں مصنف فن کی ابتدا کے متعلق لکھتا ہے: 'فنون کی ابتدا انسان کے فطرت سے متاثر ہونے سے ہوئی اور پھر انسان نے اس میں اپنی تخلیقی صلاحیت سے مزید نکھار پیدا کیا اور نئی نئی صورتیں دیں۔ اس لیے انسان عقل کی فعالیت کو فنون کی ابتدا سے انتہا تک خارج نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ انسان میں محض حیوانی ردِعمل نہیں تھا بلکہ وہ اشیا اور مظاہر کو دیکھ کر اسے استعمال میں بھی لایا اور ان میں ترمیم بھی کی۔ یہی استعمال اور ترمیم فن کی ابتدا تھی۔'(۴) انسان فطرتاً حسن پسند ہے اور فن کے جمالیاتی احساسات، آرٹ، موسیقی، شاعری، ادب اور بہت سی لطیف چیزوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ فنون کی دو اقسام یعنی صنعتی فنون اور فنونِ لطیفہ میں تقسیم کیا گیا ہے۔ فن اور جمالیات کو ایک موضوع قرار دیتے ہیں۔ فن اور جمالیات پر بحث کرتے ہوئے محمد ہادی حسین کی رائے نقل کرتے ہیں: 'فنونِ لطیفہ کی تخلیقات بجائے خود حسین ہوتی ہیں اور دنیا میں حسین چیزوں کا جو فطری سرمایہ ہے، اس میں قابلِ قدر اضافہ کرتی ہیں۔ خود حسن، حقیقت کے پہلو بہ پہلو کائنات کی ایک بنیادی قدر ہے۔ اس قدر کے بنیادی مظاہروں میں اضافہ کر کے فنونِ لطیفہ کائنات کے مقصد کی تکمیل میں ایک نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ حسین چیزیں تخلیق کرنے کے علاوہ فنونِ لطیفہ انسان میں کائنات کے حسن کا شعور پیدا کرتے ہیں اور اس طرح فطرت کے ساتھ محبت اور موانست کے رشتے میں منسلک کر دیتے ہیں۔'(۵) ڈاکٹر احمد عبداللہ لکھتے ہیں: 'تخلیق، فن، شاعری انسانی زندگی میں خوب صورتی لانے اور اسے ارفع تر بنانے میں معاون ہوتے ہیں، یہ صرف وقتی مسرت کا باعث نہیں ہوتے بلکہ زندگی کے دھارے میں ساتھ چلتے ہوئے اس کی ارفعیت میں حصہ لے کر مسلسل لطف کا باعث بنتے ہیں۔'(۶) مصنف نے فنون کی حمایت و مخالفت، فنونِ لطیفہ کے انسانی زندگی پر اثرات، دنیا میں فنون کے ابتدائی نمونوں میں مصوری، موسیقی، فنِ تعمیر، مجسمہ سازی، فنونِ لطیفہ کی مشرقی روایت اور فن کا تحقیقی رشتہ جیسے مباحث پر مدلل گفتگو کی ہے۔ مذہب نے فنونِ لطیفہ کو بنیاد فراہم نہیں کرتا بلکہ آرٹ کی انسان سے رفاقت مذہب سے بھی قدیم ہے۔ مختلف مذاہب میں آرٹ کی حوصلہ افزائی یا حوصلہ شکنی ملتی ہے۔ عیسائیت کے پیروکاروں نے آرٹ میں فن کارانہ صلاحیتوں کو اجاگر کیا ہے۔

اسلام میں موسیقی، مصوری اور مجسمہ سازی ہدفِ تنقید رہی ہے۔ مصنف نے فنونِ لطیفہ کے حوالے سے اسلامی احکام کا ناقدانہ

جائزہ زمانی تناظر کے پیش نظر رکھتے ہوئے انسانی نفسیات اور قوموں کی تہذیبی نفسیات اور اثرات کو پیش کیا ہے۔ مجسمہ سازی اور موسیقی کی حلت و حرمت میں قرآن و حدیث کا حوالہ دیا ہے۔ مذہب اسلام کے اثرات فنون پر ہمیشہ حاوی رہے ہیں۔ ارشد محمود لکھتے ہیں: 'اگرچہ لبرل اور جدید دانش ور فنونِ لطیفہ کی کسی نہ کسی شکل کو اسلام میں جائز ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، لیکن سچ یہی ہے کہ اسلام میں فنونِ لطیفہ کی جگہ نہایت محدود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی کے مسلمان حکمران اپنے پیسے زیادہ سے زیادہ باغات، محلات اور مزاروں کی تعمیر پر لگانے میں مصروف رہے اور جن فنون نے زیادہ ترقی پائی وہ جیومیٹریکل تھے یا پھر خطاطی جو زیادہ تر قرآن پاک کی آیات تک محدود رہی۔'[۷] موسیقی روح کی غذا ہے، جب کہ اسلامی مفکرین اس کو قطعاً حرام، اسلامی نظریہ اخلاق کے منافی اور سماع کی صورت میں جائز قرار دیتے ہیں۔ اموی اور عباسی عہد میں ہارون الرشید، امام غزالی اور صوفیۂ چشت کے ہاں موسیقی کا لگاؤ ملتا ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی، سید علی ہجویری اور نظام الدین سلطان الاولیا نے اس فن موسیقی کی تجدید میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ موسیقی کے ساتھ رقص کا ذکر بھی کیا ہے۔

باب دوم: مذہبی مباحث، میں برصغیر میں مذہبی احیا کی تحریکوں پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ جہاں بھی مذہب کی اصل روح کمزور ہونے لگتی ہے تو مذہبی احیا کی تحریکیں پیدا ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں: 'معاشرے میں مذہبی تحریکیں کیوں پیدا ہوتی ہیں؟ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو پس ماندگی، زوال اور معاشرے کا خرابیوں اور برائیوں میں اس حد تک مبتلا ہو جانا کہ اس سے ہر فرد کی زندگی متاثر ہونے لگے۔ جب بھی کوئی معاشرہ اس حد تک پہنچ جاتا ہے تو اس وقت اس بات کا اعادہ کیا جاتا ہے کہ صرف مذہب کی بنیادی تعلیمات کے ذریعے ہی ان خرابیوں کو دور کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ابتدائی دور کے مثالی معاشرے کا خواب بار بار احیا کی تحریکیں پیدا کرتا ہے۔'[۸] ان تحریکوں میں مہدوی تحریک، شیخ احمد سرہندی، شاہ عبدالحق محدث دہلوی، شاہ ولی اللہ، فرائضی تحریک، سید احمد شہید کی تحریک اور علی گڑھ تحریک شامل ہیں۔

عقلیت (اسلام کی رو سے) پر بحث کرتے ہوئے اپنا موقف واضح کیا ہے کہ عقل اور مذہب دونوں انسان کی فلاح و بہبود کا نصب العین رکھتے ہیں تو پھر تصادم کس بات کا ہے۔ دونوں کو معاون و مددگار ہونا چاہیے۔ دراصل ہمارے مسلم علما مفکرین کی فنونِ لطیفہ سے عدم دلچسپی کی وجہ سے غور و فکر نہیں کرتے۔ برصغیر میں اسلام کو عقلیت سے جن مفکرین نے آراستہ کرنے کی کوشش کی ہے، ان میں امام غزالی، سرسید، سید امیر علی، مولوی چراغ علی، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال ہیں۔ مصنف کے بقول: 'اسلام اصلاً عقل کا مخالف نہیں تاہم مذہب کو عقائد کا گورکھ دھندا بنانے والوں نے اس کی تصویر ہی ایسی بنائی ہے کہ اب عام طور پر لوگ یہ کہتے پائے جاتے ہیں کہ عقل مذہب کو نہیں سمجھ سکتی، اس لیے مذہب کے معاملے میں عقل کی دخل اندازی کو مذہب سے بیر اور الحاد پر مبنی سمجھا جانے لگا۔'[۹] روشن خیالی کی تحریک اٹھارویں صدی میں چلی، جس کی بنیاد عقل اور سائنسی تجربات پر تھی۔ اس ضمن میں مذہب کی اہمیت کم ہوئی تو مذہب کی جگہ ڈی ازم نے لے لی۔ برصغیر میں روشن خیالی کا آغاز انگریزوں کی آمد سے ہوا تو اس کے خلاف مزاحمت اور موافقت بھی ہوئی۔ اساس پسندوں کی ایک زبردست تحریک چلی، جس نے پاکستانی معاشرے کو رجعت پسندی کے قریب کر دیا۔

مذہبی احیا کی تحریکیں اپنے مذاہب کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے کوشاں رہی ہیں۔مصنف نے عالمی مذاہب کے دو پہلو انسانیت اور روحانیت بیان کیے ہیں۔انھوں نے مذہب کی نشاۃِ ثانیہ کی دوسری صورت کی پذیرائی کے لیے بین المذاہب مکالمے کا آغاز ہونا چاہیے۔یوں افہام وتفہیم کا ماحول سازگار ہوگا۔صوفیانہ فکر تمام مذاہب کو ایک مرکز پر لاسکتی ہے۔

باب سوم: کلچر میں برصغیر کے تین اہم ثقافتی منظر ناموں میں قدیم وادی سندھ، بدھ مت اور مسلمانوں کا منظر نامہ ہے۔ انگریزوں کی آمد نے یہاں کی ثقافتی صورتِ حال کو بہت متاثر کیا۔مسلمان ثقافتی متکلمین میں سرسید، شبلی، اکبر اور اقبال نے اس مغربی تہذیب کے خلاف آواز اٹھائی مگر عملی طور پر مخالفت نہ کر سکے۔سرسید مذہب کی جدید تفہیم چاہتے تھے اور شبلی بھی مغربی تہذیب وتمدن کو اسلام کے حوالے سے پرکھنے کا رجحان رکھتے تھے۔اقبال کا نظریہ ثقافت بیان کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے:'سرسید اور حالی کی نسبت اقبال کی مرعوبیت مختلف ہے، جب کہ اقبال اپنے باطن کی روشنی میں مغربی تہذیب کو زوال آمادہ پاتے تھے اس لیے انھوں نے مذہب کو اپنی آنکھ کا سرمہ قرار دیا اور مذہب اساس ثقافت ان کے پیشِ نظر تھی تاہم اقبال چوں کہ مذہب کو اجتہادی قوت سے لیس کرتے ہیں۔ اس لیے اقبال کا نظریہ ثقافت بھی جمود اور تعطل پر مبنی نہیں بلکہ تحریک اور تغیر پر مبنی ہے۔'(۱۰) پاکستان میں ثقافت کے دو نظریے بیان کیے، جن میں ثقافت مذہب اساس نظریات اور ثقافت کے جغرافیہ اساس نظریات۔ثقافت کو مذہبی تناظر سے دیکھا جائے تو مذہب پوجا پاٹ کا نظام اور مذہب ضابطہ حیات ہے۔یعنی مذہبی اور سماجی زندگی الگ وجود نہیں رکھتے۔ مذہب کے ثقافت پر بہت گہرے اثرات ہیں اور مذہب کو تہذیب سے جدا نہیں رکھ سکتے۔

پاکستان میں ثقافت کو مذہبی تناظر میں دیکھنے کے لیے دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا۔ اساس پسند اور ہند اسلامی ثقافت۔مصنف لکھتا ہے:'اساس پسندوں کا ثقافتی بیانیہ کلی طور پر مذہب پر مبنی تھا۔کیوں کہ ان کے خیال میں ثقافت نظریات پر استوار ہوتی ہے اور نظریات مذہب دیتا ہے۔اس لیے مذہب سے ہٹ کے کسی چیز کو وہ قبول ہی نہیں کرتے تھے۔'(۱۱) کلچر اور تہذیب کے اساس پسند ناقدین میں سراج منیر معتدل رائے رکھتے ہیں۔ ہند اسلامی ثقافت کے فروغ میں محمد حسن عسکری کا نقطہ نظر عقلی اور فکری بنیادوں پر ہے۔ وہ ہند اسلامی ثقافت کو اسلام کے بنیادی تصورات سے متصادم نہیں بلکہ بنیادی اہمیت قرار دیتے ہیں۔مصنف نے کلچر کی مابعد الطبیعیاتی اساس، ثقافت کے جغرافیہ اساس نظریات، ثقافت کا جغرافیائی تناظر اور مسلمان، زمینی ثقافت کا نظریہ، مادری و پدری اصول تہذیب، ثقافت کا اشتراکی نظریہ، لینن کا ثقافتی نقطہ نظر، برصغیر میں مادیت پسند رجحانات کا آغاز، ترقی پسند تہذیبی نظریے کی بنیادیں، مادی تصورحسن، ارفع تہذیب کا تصور، گلوبلائزیشن، عالم گیریت کیا ہے؟ عالم گیریت کا نظریہ کیوں پیدا ہوا، عالم گیریت کے لوازم، کیا موجودہ دنیا گلوبل ویلج ہے؟، عالم گیریت کے نتائج، تہذیبی عالم گیریت کے امکانات، تہذیبی وثقافتی انتشار، عینی کلچر، حسیاتی کلچر، ارفع معاشرے کی بنیادیں، مساوات وانصاف، دولت کی تقسیم، ثقافتی گھٹن، ثقافتی گھٹن کے اثرات، عالمی صورتِ حال، مغرب کا تہذیبی انتشار جیسے مباحث پر گفتگو کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کی پاکستان کی تشکیل میں نہ تو محض مذہب بنیاد بن سکتا ہے، نہ محض جغرافیہ، نہ محض تاریخ بلکہ یہ ان سب کے آمیزے سے شکل پذیر ہوگی۔

سجاد باقر رضوی کے مادری اور پدری اصول، ڈاکٹر وزیر آغا کی ارضی ثقافت، ڈاکٹر جمیل جالبی کے کلچر کے زوال کے اسباب، عینی وحسیاتی کلچر، انتظار حسین کا تہذیبی لین دین، صلاح الدین درویش کا فلسفہ تہذیب، کرار حسین، سبطِ حسن اور انتظار حسین کے متحدہ ثقافتی تشخص کا اظہار، ان تمام مباحث کو مصنف نے خوش اسلوبی سے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: 'کلچر تبدیلی کا ایک مسلسل عمل ہے۔ انسانی تہذیب ہر دور میں ارتقا پذیر رہی ہے اور جب بھی کوئی تہذیب ماضی سے محض چمٹنے پر اصرار کرتی ہے۔ حال اور مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے ماضی سے تخلیقی رشتہ استوار نہیں کرتی۔ وہ فنا کے راستے پر گامزن ہو جاتی ہے۔'[۱۲]

باب چہارم: فنونِ لطیفہ میں برصغیر میں فنونِ لطیفہ کے ارتقا کے حوالے سے گندھارا آرٹ، موریا آرٹ اور جین آرٹ کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے تہذیبی و ثقافتی گہوارے میں فنونِ لطیفہ کے فروغ میں بادشاہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ موسیقی کے حوالے سے سلاطین کی سرپرستی بہت محدود تھی۔ 'اگرچہ مسلمان ارتقائی اعتبار سے مسلسل موسیقی کی پرورش نہ کر سکے۔ اس کے باوجود اس فن میں امیر خسرو جیسے نابغہ کی موجودگی اس بات کا اظہار ہے کہ مسلمان اس سے بالکل غافل بھی نہیں رہے اور وقتاً فوقتاً اس فن کی پرورش کرنے والے میسر آتے رہے۔ جس کے باعث فنِ موسیقی سے وابستہ فن کاروں کے ساتھ ساتھ علم موسیقی کے پارکھ بھی پیدا ہوئے۔'[۱۳] برصغیر میں مسلم فن تعمیر کا یادگار دور مغلوں کا دور قرار دیا جاتا ہے۔ سلطان قطب الدین ایبک، بلبن، خلجی، تغلق، فیروز شاہ، سید اور لودھی خاندان، مغل بادشاہوں کے دور کو فنونِ لطیفہ کا کامیاب ترین دور تسلیم کیا جاتا ہے۔ مسلم فنِ تعمیر کے ساتھ یہ فن ہندو مت اور بدھ مت میں بھی شامل رہا ہے۔ برصغیر میں مغل حکمرانوں نے فن مصوری کو کمال عروج تک پہنچایا۔

قیامِ پاکستان کے بعد فنون کے دو بڑے نقطہ نظر سے دیکھا گیا۔ فن برائے فن اور فن برائے مقصد۔ مصنف نے فن برائے مقصد کو مزید تقسیم کیا ہے جسے اسلامی نقطۂ نظر اور ترقی پسند نقطۂ نظر پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ فنون کے معاملے میں بھی یہ تقسیم کچھ ایسے ہی بنتی ہے کہ اساس پسند مفکرین، اسلام پسند پاکستانی انفرادیت کی سوچ کے حامل اور تیسرے ترقی پسند، جن کی اساس فکر مارکسی ہے تاہم پاکستان بھی ان کی سوچ کا محور ہے۔ اساس پسند مفکرین، جدید اسلامی ذہن کے حامل پاکستانی مفکرین، ترقی پسند مفکرین پر اپنا تجزیہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر احمد عبداللہ لکھتے ہیں: 'ہمارے خیال میں نظریات، جغرافیہ اور مذہب سب علوم وفنون و ادب پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ جتنی بحث اساس پسندوں اور اشتراکی مفکرین میں اس ضمن میں ہوئی تو اس میں اندازِ فکر کی ایک غلطی ہے، جس نے بحث کا رخ غلط کیا۔ وہ یہ کہ مختلف نظریات کے حامل ادیب و فن کار اپنی کاوشیں پیش کرتے رہیں اور کسی پر قدغن نہ ہو کہ فلاں نظریے کے حاملین غلط ہیں یا اسلامی مملکت میں ان کا وجود ناقابلِ برداشت ہے۔ آنے والا وقت خود ہی طے کر دے گا کہ کس فن پارے میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے اور کس کا فن وقتی حالات و جذباتی کیفیات کا پیدا کردہ تھا۔ یوں مختلف انداز کے فنون بھی اپنی اپنی نیچر کے مطابق پرورش پاتے رہیں گے اور معاشرہ تخلیقی جمود کا شکار نہیں ہوگا اور ساتھ اختلاف رائے جیسی صحت مند روایت سوسائٹی کو جدید خطوط پر استوار کرنے اور نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کا فریضہ بھی انجام دیتی رہے گی۔ اصل میں معاملہ دونوں طرف سے تنگ نظری کا ہی رہا ہے، وگرنہ دونوں کا وجود معاشرتی ارتقا کے لیے اہم ہے۔ قدامت اور جدت کا توازن ہی معاشرے کو فطری ارتقا سے آشنا کرتا ہے،

وگرنہ یا تو معاشرہ جامد ہوجاتا ہے یا اتنی رفتار پکڑ لیتا ہے کہ کسی بڑے حادثے کا شکار ہوسکتا ہے۔[۱۴]

مصنف نے قیامِ پاکستان کے بعد فنونِ لطیفہ (عملی صورتِ حال) اور آزادی کے پچاس برسوں میں فنونِ لطیفہ پر جائزہ پیش کرتے ہوئے اسلامیہ جمہوریہ پاکستان میں فنونِ لطیفہ کی حالت زار بیان کی ہے۔علاقائی فنون کی روایت اور قومی کلچر کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے قومی یا عالمی سطح کے فنی اظہار کو ممکن بنانے کی کوشش کی ہے۔فن اور اخلاقیات کا رشتہ مضبوط کرنے کے لیے سوسائٹی کو چاہیے کہ وہ فنون کو اس تربیت وتہذیب کے لیے استعمال کریں، جو انسانوں کے لطیف ترین جذبات، خیالات اور عزائم کو دعوت اظہار و عمل دے۔ اروِن ایڈمن لکھتے ہیں: ’فن کار جب خوشبو لگائے ہوئے نام نہاد جمال پرست کے رتبے سے اونچا ہوجاتا ہے تو اپنے وسیلہ اظہار کی اخلاقی طاقت اور تخیلی تاثیر کا انکار نہیں کرتا۔خود افلاطون کہتا تھا وہ گیت گاؤ، وہ کہانیاں سناؤ جن کی بنا پر انسانوں کو ترغیب ہو کہ وہ ایک مکمل اور منتظم ریاست قائم کریں۔‘[۱۵] اس مقالے کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں مذہب، کلچر اور فنونِ لطیفہ کے تمام مباحث کو جوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حواشی

۱۔ علامہ یوسف القرضاوی، ’’اسلام اور فنونِ لطیفہ‘‘، ص ۲۴
۲۔ ڈاکٹر احمد عبداللہ، ’’مذہب، کلچر اور فنونِ لطیفہ‘‘، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۲۴ء، ص ۲۸
۳۔ ایضاً، ص ۴۵
۴۔ ایضاً، ص ۶۶
۵۔ ایضاً، ص ۷۴
۶۔ ایضاً، ص ۷۷
۷۔ ایضاً، ص ۹۹
۸۔ ایضاً، ص ۱۲۲
۹۔ ایضاً، ص ۱۵۶
۱۰۔ ایضاً، ص ۱۸۶
۱۱۔ ایضاً، ص ۱۹۸
۱۲۔ ایضاً، ص ۳۸۲
۱۳۔ ایضاً، ص ۲۹۳
۱۴۔ ایضاً، ص ۳۱۷
۱۵۔ ایضاً، ص ۳۳۱

نعمان بدر فلاحی ❁

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C, Latifabad, Hyderabad.

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کی ادبی خدمات

اسلامیات اور معاشیات کے میدان میں عظیم ترعلمی، تصنیفی اور تحقیقی خدمات کے اعتراف میں حکومت سعودی عرب کی جانب سے ۱۹۸۲ء میں 'شاہ فیصل ایوارڈ' یافتہ ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی اپنے تحقیقی اور اجتہادی مزاج کے ساتھ ایک ادیب بھی تھے۔ بالکل ابتدائی زمانے میں ادب اسلامی کا جو ادارہ جماعت اسلامی نے ۱۹۴۸ء میں قائم کیا تھا اور ۱۹۵۴ء میں جس کا باقاعدہ ایک تحریری دستور وضع کیا گیا تھا، نجات اللہ صدیقی اس کی سرگرمیوں اور پروگراموں میں ابتدائی عمر سے ہی شریک ہونے لگے تھے۔

ستمبر ۱۹۴۹ء میں علی گڑھ میں داخلے کے بعد انھوں نے یونی ورسٹی میں ''کل ہند اسلامی ادب میٹ'' منعقد کرنے کی منظم کوشش کی تھی مگر یونی ورسٹی پراکٹر سے اس کی اجازت نہ ملنے کے سبب اسے ملتوی کرنا پڑا۔ ابتدائی زمانے میں انھوں نے چند افسانچے اور کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ ثانوی درسگاہ کے طالب علم جناب محمود مصطفیٰ صدیقی معروف بہ ابنِ فرید (۱۹۲۵ء۔ ۲۰۰۳ء) کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ رام پور کے آخری زمانے میں انھوں نے 'کشمکش' کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا تھا جس میں جنسی تذکرے کے سبب قیم جماعت اسلامی مولانا محمد یوسف صاحب کو اس پر سخت اعتراض تھا۔ جولائی ۱۹۵۳ میں مکتبۂ معیار' میرٹھ سے شائع ہونے والے تعمیری ادب کے ترجمان افسانوں اور ڈراموں کے مجموعے ''ابھرتی کرنیں'' میں وہ افسانہ موجود ہے۔ مرکز جماعت اسلامی میں اُس افسانے پر سخت ردعمل کو دیکھتے ہوئے ابن فرید نے نجات اللہ صدیقی کے نام ایک خط میں لکھا:

> آپ نے 'کشمکش' میں یہ ضرور ہے کہ جنسی پہلو کے بارے میں کافی احتیاط برتی ہے، لیکن جملوں کی ساخت کسی قدر الجھ گئی ہے جس سے ایسا کچھ مترشح ہوتا ہے جیسے آپ نے جنس پسندانہ تذکرہ کیا ہے۔ میری نظر میں آپ نے جو تذکرہ کیا ہے وہ غیر محتاط نہیں ہے، البتہ دوسرے لکھنے والے ضرور اب کثرت سے جنسی افسانے لکھ رہے ہیں۔ مرکز میں اس کے خلاف سخت ردعمل ہو رہا ہے۔ کاش کوئی اسلامی ادب میں جنس کے جائز استعمال پر اصولی مقالہ لکھ سکتا۔

دوسرے خط میں ابنِ فرید نے پھر لکھا:

> فی الحال اس موضوع پر کچھ لکھ کر شائع کرائیے کہ ادب اسلامی میں جنس کا کیا مقام ہے۔ اس کا ذکر

❁ ریسرچ اسکالر، شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، ہندوستان۔ برقی پتا:nomanbadaralig@gmail.com

افسانوں اور نظموں میں کس حد تک مناسب ہے اور تجاوز کس حد سے نہ کرنا چاہیے۔(۱)

بالآخر 'اسلامی ادب اور تصورِ جنس' کے موضوع پر خود ابن فرید نے ہی ایک مبسوط مقالہ تحریر کیا جو پہلے ماہ نامہ معیار (میرٹھ) کے مئی ۱۹۵۷ء کے لکھنؤ کانفرنس نمبر میں شائع ہوا۔ بعد میں نجات اللہ صدیقی نے ادب سے متعلق نظریاتی مقالات کا مجموعہ ''اسلامی ادب'' کے نام سے ۱۹۶۰ء میں شائع کیا تو تصورِ جنس سے متعلق ابن فرید کے مذکورہ مقالے کو بھی اس میں شامل کیا۔

بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں جب کہ ادبی حلقے 'اسلامی ادب' کی اصطلاح سے نامانوس اور اس کی تحریک سے ناآشنا تھے، ادارہ ادب اسلامی ہند کے زیرِ نگرانی قائم ہونے والے اداروں اور جاری ہونے والے رسالوں نے ترقی پسندی کے مقابلے میں تعمیری ادب کی داغ بیل ڈالی۔

ادارہ ادب اسلامی ہند کے صدر مولانا عروج قادری نے فروری ۱۹۵۳ء میں پٹنہ سے انھیں اپنے خط میں لکھا:

> عنقریب تمام حلقوں میں چند سوالات کا ایک پرچہ میرے طرف سے پہنچے گا۔ میرا خیال ہے کہ ادارہ ادب اسلامی ہند کی ترقی میں ایک بڑا مانع یہ ہے کہ ہم اب تک اس کا کوئی سالانہ اجتماع اس کی شایانِ شان منعقد نہ کرسکے۔ جماعت کے سالانہ اجتماع کے ساتھ یہ محض ضمیمہ کی طرح ہوتا رہا۔ رام پور میں میں نے خود محسوس کیا تھا کہ ادھر اتنی توجہ نہیں دی جاسکی جتنی دینی چاہیے۔ حیدرآباد میں اجتماع ہوا، وہاں فن کار بھی جمع ہوئے لیکن مجھے اس کی خبر نہیں کہ آیا وہاں اس کام کو آگے بڑھانے کا کوئی پروگرام اور نقشہ کار بنایا گیا یا نہیں۔ حالاں کہ وہی موقع تھا جب کہ آئندہ کے لیے نقشہ کار بنالیا جاتا۔
>
> میں نے برادر شفیع مونس صاحب (ادارہ ادب اسلامی کے رکن اور نائب امیر جماعت اسلامی) کو لکھا تھا کہ وہاں کوئی پروگرام بنایا گیا ہو تو مطلع فرمائیں لیکن اب تک کوئی جواب نہیں آیا۔
>
> گزشتہ رپورٹوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دستور کے متعلق بھی ہمارے فن کار رفقا کا ذہن مطمئن نہیں ہے۔ اگر دستور پر ہمیں اطمینان حاصل نہ ہو تو کام کیسے آگے بڑھ سکے گا۔ دستور کی مانگ اِدھر اُدھر سے آنی شروع ہوگئی ہے، اس لیے فی الحال میرے پیشِ نظر یہ ہے کہ دستور طبع کرالیا جائے۔ ظاہر ہے کہ طباعت سے پہلے ہمیں اس کو زیادہ سے زیادہ مکمل کرلینے کی سعی کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں آپ کے جو خیالات ہوں اور دیگر رفقا کی جو تجویزیں ہوں ان سے آگاہ فرمایئے۔
>
> نقشہ کار اور پروگرام کے سلسلے میں جو باتیں آپ لوگوں کے ذہن میں ہوں ان سے بھی مطلع کرکے میری مدد کیجیے۔ میں اس وقت بہتیری عارضی پریشانیوں کی وجہ سے زیادہ سوچنے کا وقت نہیں پارہا ہوں۔(۲)

''معیار'' میرٹھ کی اشاعت موقوف ہوجانے کے بعد ادارہ ادب اسلامی ہند کے ترجمان کی حیثیت سے رام پور سے ۱۹۵۹ء میں مکتبہ الحسنات کے مالک مولانا عبدالحی صاحب کے مالی تعاون سے ماہ نامہ ''دانش'' جاری کیا گیا تھا۔

۹ رجنوری ۱۹۴۹ء کے ''الانصاف'' (الٰہ آباد) میں ''ریل کا ڈبہ'' کے عنوان سے ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کا ایک فکر انگیز، نظریاتی اور ادبی مضمون شائع ہوا تھا جس کا اقتباس ملاحظہ کریں:

> اور میں سوچ رہا تھا کہ تحریک اسلامی کی ترویج کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے...اور میں سوچ رہا تھا کہ حضورؐ نے (حضرت ابوبکرؓ) سے پوچھا گھر کیا چھوڑ کر آئے ہو؟...اور میں سوچنے لگا کیا میں صرف سوچتا ہی رہ جاؤں گا؟
>
> کیا یہ زندگی پیسوں پر سے قدم رکھ کر نہیں گزر رہی ہے؟ بلا پیسے کے بھی کہیں زندگی چلی ہے؟
>
> لیکن زندگی حضرت ابوبکرؓ نے بھی گزاری تھی۔ اور میں سوچنے لگا کہ جب ریگستان کی گرم ہوا پر کئی دن گزارنے والوں نے اس مسئلے کو حل کرلیا تو آج پیسے کا مسئلہ کیوں حل نہیں ہوسکتا؟ اور میں ہنس پڑا اپنی بیوقوفی پر...کیا کر رہے ہیں وہ لوگ جنھیں اللہ نے دین کا ذرا بھی شعور دیا ہے؟ وہ بستروں پر سوتے ہیں، نرم نرم بچھونوں پر کیا وہ تو آرام کرسیوں پر بیٹھ کر حقہ اور سگریٹ کا دھواں بھی اڑا لیتے ہیں۔ اف رے جہالت! اور میرا جی چاہا کہ آگے بڑھوں اور اُن کے گریبان چاک کر ڈالوں، ان کے پاؤں میں کانٹے چبھو کر آبلے پیدا کردوں، ان کو دھکے دے کر دوڑنے پر مجبور کر دوں۔ اٹھو اور جاؤ۔ جاؤ اپنا پیغام لے کر پھیل جاؤ، خود سنورو اور سنوارنے کی مہم کا آغاز کرو۔ پختہ رہو اور پختگی کا پرچار کرو۔ اور پھر ٹکرا جاؤ اپنے مالک کے حکم سے اُن ایوانوں سے، ٹکرا جاؤ اُن سے جہاں سرمایہ پرستانہ نظام زندگی خواہش پرست جاہلیت کی حفاظت میں خراٹے لے رہا ہے، جہاں مادہ پرستی اور لادینیت رنگ رلیاں منارہی ہیں، ان کو توڑ دو۔ اس قیادت کو چوٹی سے پکڑ کر زمین پر لے آؤ۔ گاڑی چلی جارہی تھی اور میں خیالات کے دریا میں ڈوبا ہوا تھا۔

۱۹۵۳ء میں نجات اللہ صدیقی کا ایک افسانہ نجم الاسلام اور بدر فاروقی کی ادارت میں شائع ہونے والے صحت مند اور تعمیری ادب کے علم بردار ماہ نامہ ادبی رسالے ''معیار'' میں ''ایک گلاس لسی'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا جو ابن فرید کے مطابق بہت مقبول ہوا اور اسے لکھنؤ کے ایک ادبی پرچے 'فن کار' نے بھی جگہ دی تھی۔ معیار کی جولائی ۱۹۵۵ کی اشاعت میں ان کا مضمون ''اسلامی ادب'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ (افسانہ ''ایک گلاس لسی'' ماہ نامہ ''پیش رفت'' دہلی کی دسمبر ۲۰۲۲ء کی اشاعت میں دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔)(۳)

کراچی یونی ورسٹی میں فلسفے کے پروفیسر اور ثانوی درسگاہ رام پور کے سابق استاذ ڈاکٹر منظور احمد صاحب نے اکتوبر ۱۹۵۸ء میں نجات اللہ صدیقی کو لکھا:

> معلوم نہیں آپ نے افسانہ لکھنا کیوں چھوڑ دیا؟ چراغ راہ میں مجھ کو دو چیزوں کی کمی محسوس ہوتی ہے، اور وہ ہے اچھے افسانوں اور ادب پر عمدہ قسم کے مضامین کی کمی۔ ہندوستان کے لکھنے والوں سے میں ذاتی طور پر واقف نہیں ہوں، علی گڑھ میں بھی ضرور کچھ لوگ ہوں گے۔ آپ میرا ہاتھ بٹا سکیں تو میں مشکور ہوں گا۔ (۴)

نجات اللہ صدیقی کی ابتدائی زمانے کی متعدد ادبی نگارشات ''الانصاف''، الٰہ آباد (سنہ اجرا: جنوری ۱۹۴۸ء)، ''معیار'' میرٹھ (سنِہ اجرا: ۱۹۵۱ء)، ''دانش''، رام پور (سنِہ اجرا: ۱۹۵۹ء)، ''نئی نسلیں''، لکھنؤ (سنِہ اجرا: ۱۹۵۴ء)، ''چراغِ راہ''، کراچی (سنِہ اجرا: ۱۹۴۸ء)، ''مشیر''، کراچی (سنِہ اجرا: ۱۹۴۹ء) جیسے رسالوں میں موجود ہیں۔ (تعمیری ادب کے ترجمان ان رسالوں کی تاریخ اور خدمات پر باضابطہ ایک تحقیق اور ریسرچ کی ضرورت ہے۔)

۱۹۵۴ء میں لکھنؤ سے 'نئی نسلیں' جاری کیا گیا تو اس کے ابتدائی شمارے پر نجات اللہ صدیقی نے تبصرہ کرتے ہوئے اپنی مفصل رائے کا اظہار کیا۔ مدیر رسالہ نسیم صاحب نے اپنے جوابی مکتوب بتاریخ ۱۰ ؍فروری ۱۹۵۵ء کو انھیں لکھا:

> فکشن میں آپ نے غیر حکیمانہ اور Risky قسم کے جس سقم کی طرف توجہ دلائی ہے، مجھے واقعتاً اس میں دونوں پہلو نظر نہیں آئے۔ ایک عام صورت حال پر اگر ایک شخص کے فکر و انداز میں ایمان بالغیب کی کیفیت جھلکے تو یہ اسلوب ممکن ہے کہ ابھی تک کے تنقیدی معیار پر پورا نہ اترے، مگر میں اس میں بڑے امکانات پاتا ہوں۔ رہا فن اور تناسب کا سوال تو اس میں کلام کیا جاسکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے اس کا ماخذ متعین کرنے کے لیے بہت گہری سطح کو معیار مانا ہے۔ حالاں کہ روزمرہ محاورے میں بھی 'دایاں بایاں فرشتہ' والے جملے اس کا ماخذ قرار دیے جا سکتے ہیں۔ خصوصاً اس سبب سے کہ ثریا سلیم صاحبہ خود خاتون ہیں اور اس طرح کے جملے گھروں ہی میں مستعمل ہیں۔ پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ فنی معیار کے لحاظ سے جن افسانوں کا اپروچ سادہ ہو وہ کم سے کم جگہ پائیں۔
>
> منظومات کے سلسلے میں بفضل خدا آپ نے اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ مقالوں سے آپ کو غالباً ابھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی ہوگی، کیوں کہ میں وسیع تر حلقوں سے نگارشات حاصل کرنے میں لگا ہوا ہوں۔ نعرے اور سلوگن پر نجم صاحب کا اعتراض اس معنیٰ میں ہے کہ ابھی ہماری تحریک کو ادبی نعرے بنانے مناسب نہیں۔ مگر میں عرض کروں کہ، نئی نسلوں کا سلوگن '' ادب برائے

زندگی۔زندگی برائے بندگی'' صرف رسالے تک محدود ہے۔اور یہ ظاہر ہے کہ 'نئی نسلیں' کسی تحریک کے آرگن کی حیثیت نہیں رکھتا۔(۵)

نومبر ۱۹۵۵ء میں نجات اللہ صدیقی کی کوششوں سے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے یونین ہال میں ادارۂ ادب اسلامی کے تحت ایک ادبی اجتماع منعقد ہوا تھا جس میں شعبۂ اردو کے ڈاکٹر محمد عزیر کے علاوہ شعبۂ فارسی میں پروفیسر مولانا ضیا احمد بدایونی بھی شریک ہوئے تھے۔(۶)

دسمبر ۱۹۵۶ء میں ادب اسلامی کی علی گڑھ یونٹ نے اپنا سالانہ اجتماع دوبارہ یونین ہال میں منعقد کیا جس میں اسلامی ادب سے متعلق غور طلب مسائل کی ایک فہرست بنائی گئی اور اسے بحث کے لیے باضابطہ عنوانات کی شکل میں ضبطِ تحریر میں لایا گیا۔اس اجتماع میں آئندہ ماہ لکھنؤ میں منعقد ہونے والی ادبی کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لیے بھی غور وفکر اور منصوبہ بندی کی گئی۔(۷)

ادب اسلامی کی کل ہند لکھنؤ کانفرنس

ادارۂ ادب اسلامی کی جانب سے ۵-۶ رجنوری ۱۹۵۷ء کو لکھنؤ میں پہلی بار ایک کل ہند ادبی کانفرنس منعقد ہوئی جس مین تعمیری ادبیات اور اقدار پر مبنی شاعری سے متعلق عظیم شخصیات نے شرکت کی تھی۔شفیق جونپوری، معزز علی بیگ، عامر عثمانی، اصغر علی عابدی، سہیل احمد زیدی، کوثر یزدانی، ابو المجاہد زاہد، رشید کوثر فاروقی، شبنم سبحانی، م نسیم، سید زین العابدین، انور صدیقی، سید انور علی، عزیز اقبال، شاکر تسلیم، مختار احمد مظاہری، اسحاق احمد ایڈوکیٹ، ابن فرید اور نجات اللہ صدیقی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔۵ رجنوری کو گنگا پرشاد میموریل ہال میں منعقد پہلے عمومی اجلاس کی صدارت شفیق جونپوری نے کی جب کہ اسی ہال میں دوسرے روز منعقد اجلاس کے صدر نشین تھے ماہ نامہ ''تجلی'' کے مدیر جناب عامر عثمانی صاحب۔''صدق جدید'' کے مدیر مولانا عبد الماجد دریابادی اور پروفیسر ضیا احمد بدایونی (علی گڑھ) نے کانفرنس کے لیے اپنے پیغامات ارسال کیے تھے۔

ابنِ فرید کی رپورٹ کے مطابق پہلے روز منعقد سمپوزیم میں علی گڑھ میں انگریزی ادب کے نوجوان لکچرر زین العابدین صاحب کے علاوہ بی اے کے طالب علم نجات اللہ صدیقی نے تقریباً ایک گھنٹے تک اسلامی ادب کے ان گوشوں پر روشنی ڈالی جن پر اب تک توجہ نہیں دی گئی تھی۔سمپوزیم میں اظہار خیال کرتے ہوئے نجات اللہ صدیقی نے فرمایا:

> اسلامی ادب فرقہ پرست ادب نہیں ہے۔دوسرے نظریات کی طرح اسلام کو بھی اپنے نظریے کی اشاعت کے لیے ادب کو استعمال کرنے کا پورا پورا حق ہے۔اسلامی ادب کی تحریک سے کسی کو رشک وحسد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔جس طرح دوسری تحریکوں نے ادب کو اب تک کچھ نہ کچھ دیا ہے اسی طرح اسلامی ادب بھی ادب کے سرمایے میں اضافہ ہی کرے گا۔(۸)

سید زین العابدین صاحب کی صدارت میں منعقد دوسرے سمپوزیم میں نجات اللہ صدیقی نے ''اسلامی ادب کی تنقید وتخلیق میں

مثبت قدروں کی اہمیت'' کے موضوع پر گفتگو کی۔ رپورٹ کے مطابق نجات صاحب کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرزہ تھا اور وہ ایک ایک پوائنٹ کو دیکھ کر اس کی وضاحت کرتے چلے جارہے تھے۔'' قدر ایک رویہ اور رجحان کا نام ہے جو زندگی کے کسی شعبے میں پروان چڑھتا ہے۔ اسلام نے فروعی تعبیرات کو ہر دور کے مختلف تقاضوں کے لیے چھوڑ دیا ہے لیکن زندگی کے تمام مسائل کے لیے بنیادی قدروں کا تعین کردیا ہے۔ ادیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ کتاب وتفسیر کا مطالعہ ہی قدروں کے احساس کے لیے کافی نہ سمجھے بلکہ اپنے داخل سے ان کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرے۔قرآن نے کائنات میں تفکر وتدبر پر زور دیا ہے اور بار بار مشاہدۂ قدرت کی طرف انسان کو متوجہ کیا ہے۔ اسلامی ادیب کا فرض ہے کہ وہ زندگی کے مطالبوں کی طرف سے آنکھیں بند نہ کرے بلکہ تجربات حیات میں بیدار شعور کے ساتھ قدم رکھے۔ ادیب کے لیے مثالی کردار اور ساری تعمیری قدروں کا مرکز رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہے۔ اسلامی ادب کو اصطلاحات والفاظ کی جگہ مفہوم وادراک سے قریب ہونا ہے۔''(۹)

اوڈین ہال، نظر باغ، لکھنؤ کے وسیع ہال میں منعقد ہونے والے سمپوزیم کا موضوع تھا'' اسلامی ادب کیا ہے؟'' سمپوزیم میں معزز علی بیگ (لکچرر، شعبۂ فلسفہ، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ)، سید زین العابدین (لکچرر، شعبۂ انگریزی، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ) م نسیم (ایڈیٹر ماہ نامہ ''نئی نسلیں''، لکھنؤ)، اصغر علی عابدی (مدیر، سہ روزہ ''دعوت''، دہلی) کے علاوہ نجات اللہ صدیقی نے بھی خطاب کیا۔ انھوں نے فرمایا:

> ہر ادیب دراصل ایک راہ کی تلاش میں ہوتا ہے، پھر اگر اس کے داخلی سوالات کا جواب اسلام سے ملتا ہے تو اسلامی اقدار اس کے دل کی آواز بن جاتی ہیں، باہر سے لادی نہیں جاتیں۔اسلام کے بنیادی تصورات پر ادیب کا یقین جتنا پختہ ہوگا اس کے جذبات میں اتنی ہی گہرائی ہوگی۔ اسلامی طرز زندگی کا عرفان اسلامی ادیب کا مثالی عشق بن جاتا ہے۔ جو ادیب خیر کو خیر اور شر کو شر سمجھتا ہے وہ تعمیر زندگی کے صحیح نقطہ نظر کی جستجو میں رہتا ہے اور فکر وعمل میں تصادم کے امکانات پر ضرب لگاتا ہے۔ اسلام میں ہیئتیں کوئی امتیازی مقام نہیں رکھتیں، بلکہ بنیادی جذبہ اصل شے ہوتا ہے۔لیکن ساتھ ہی بعض ہیئتیں مستقل مزاج رکھتی ہیں۔ سماج کی جنسی زندگی کے لیے اسلام نے کچھ ابدی ہیئتیں دی ہیں۔
>
> ہر ادب سماج کی عکاسی کے ساتھ اس کی تنقید بھی ہوتا ہے۔ اسلامی ادب بلکہ ہر نظریاتی ادب کی توجیہ اس طرح کیجیے کہ ادب داخلی کیفیات کی ترجمانی کا نام ہے۔ ہم نظریات کی کوئی Text Book نہیں رکھتے بلکہ تنقید کے پیمانے ضرور رکھتے ہیں جن کی بنا پر یہ طے کیا جاتا ہے کہ کون ادیب اپنے داخلی تصورات کو کہاں تک اسلام کے بنیادی اصولوں سے ہم آہنگ کرسکا ہے۔(۱۰)

معیار کے لکھنؤ کانفرنس نمبر میں نجات اللہ صدیقی کی ایک تحریر بعنوان ''اسلامی ادب کا مزاج'' شائع ہوئی ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے:

> ادب اور اسلام دونوں سے مخلصانہ وابستگی ہی ہم کو اُس یک رخے پن سے بچا سکتی ہے جس میں معاصر نظریاتی ادب مبتلا رہا ہے۔ معاش ہو یا جنسی زندگی کے کسی ایک شعبے ہی کا ادب پر چھا جانا اور ان کو دوسرے شعبوں پر بے جا ترجیح دینا ایک غیر فطری مظہر ہے جو ادب کے حقیقی تقاضوں سے صرف نظر اور بعض غیر معتدل اور یک طرفہ نظریات سے وابستگی کا نتیجہ ہے۔ سچا اسلامی ادب ہمہ گیر بھی ہوگا اور داخل و خارج میں وہ توازن برقرار رکھے گا جو فطرت اور حقیقت پسندی کا تقاضا ہے۔(۱۱)

نظریاتی مقالات کا مجموعہ 'اسلامی ادب'

نجات اللہ صدیقی نے خدا پرستانہ اور تعمیری ادب کی ترجمانی کرنے والے مشاہیر کے ۹ عدد نظریاتی مقالات کا مجموعہ ''اسلامی ادب'' کے نام سے مرتب کیا جو شعبۂ نشر اشاعت ادارۂ ادب اسلامی ہند نے ۱۹۶۰ء میں شائع کیا۔ تقریباً ۲۰۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں نعیم صدیقی کا مقالہ بعنوان ''اسلامی ادب''، ڈاکٹر محمد عزیر کا مقالہ بعنوان ''اسلامی ادب کا منصب''، سید اصغر علی عابدی کا مقالہ بعنوان ''ادب اور تمدن''، محمد حمید اللہ صدیقی کا مقالہ بعنوان ''ادب اور سماج''، ابنِ فرید صدیقی کا مقالہ بعنوان ''اسلامی ادب اور تصورِ جنس''، نجم الاسلام کا مقالہ بعنوان ''ادب اور تنقید کا تعمیر پسند نظریہ''، سید زین العابدین کا مقالہ بعنوان ''اسلامی ادب اُردو ادب کو کیا دے سکتا ہے''، عماد الحق صدیقی کا مقالہ بعنوان ''اسلامی ادب کی فلسفیانہ بنیادیں'' اور مرتب محمد نجات اللہ صدیقی کا مقالہ بعنوان ''اسلامی ادب کا مزاج'' شامل ہیں۔

پیش لفظ میں نجات اللہ صدیقی لکھتے ہیں:

> اسلامی ادیبوں نے شعری اور افسانوی ادب میں اسلامی اقدار حیات کی ترجمانی اور اسلامی زاویۂ نگاہ سے اپنے سماج کے مطالعہ کی قابل قدر کوششیں کی ہیں۔ قدرتی طور پر تحریک کے اس ابتدائی مرحلے میں ان ادیبوں کی توجہ تخلیقی ادب کی طرف زیادہ رہی ہے اور تنقید کے میدان میں کم کام ہوا ہے۔ جہاں تک خود اسلام کے بنیادی افکار اور اسلامی نظام زندگی کے مختلف پہلوؤں کا تعلق ہے، عربی، اردو اور انگریزی میں ایک وسیع لٹریچر موجود ہے۔ اور اسلامی ادیبوں کو اس سلسلے میں علیحدہ سے کسی خصوصی کوشش کی زیادہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ ان اصولوں اور اسلامی نظام زندگی کے مختلف پہلوؤں کا تخلیقی ادب کے زاویہ نگاہ سے فہم اور ان کے فنی تاثرات کے اظہار میں ان کی ادبی تعبیر ایک اہم کام ہے جس کی اسلامی ادیبوں سے توقع کی جانی چاہیے''۔

کتاب میں ادب کے تعلق سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا ایک اقتباس نقل کیا گیا ہے:

> معاش کے لیے کوئی ادب پیدا کرنا میرے نزدیک غلط ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ معاش کے لیے آدمی اینٹیں ڈھو لے۔ ادب دماغوں کو ڈھالنے والی چیز ہے۔ یہ کام محض معاش کے لیے نہیں کیا جاسکتا۔ (۱۲)

کتاب کے آخر میں اسلامی ادب کی ترجمانی کرنے والے متعدد افسانوی اور شعری مجموعوں، ناولوں اور منتخبات کے علاوہ ''چراغِ راہ'' کراچی، ''دانش'' رام پور، ''مشیر'' کراچی، ''معیار'' میرٹھ، ''نئی نسلیں'' لکھنؤ، ''انوار'' حیدرآباد، ''حیاتِ نو'' حیدرآباد، ''سلسبیل''، ''جہانِ نو'' اور ''نیا انسان'' وغیرہ کی خصوصی اشاعتوں کی فہرست بھی پیش کی گئی ہے تاکہ اسلامی تصور ادب کی تفہیم کے لیے ان کی طرف رجوع کیا جاسکے۔ ادب سے متعلق نجات اللہ صدیقی کی دوسری تصنیف ''فنونِ لطیفہ اور اسلام'' ہے جس کا مطالعہ اہلِ علم و دانش کے لیے مفید معلوم ہوتا ہے۔

ماہ نامہ ''معیار'' (میرٹھ) کے جولائی ۱۹۵۵ء کے شمارے میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کا ایک مضمون ''اسلامی ادب'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے مختلف حلقوں کی جانب سے اسلامی ادب کے سلسلے میں کیے جانے والے اعتراضات اور شبہات کا جائزہ لینے کے بعد مدلل جواب پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> اسلامی ادب وہ ادب ہے جو فرد اور معاشرہ دونوں کی فلاح و بہبود کو اسلامی نظام زندگی سے وابستہ سمجھتا ہے۔ اور اسلامی ادیب وہ ہے جو حسن اور سلیقے کے ساتھ ایسے افکار و احساسات کو پیش کرے جو سماج کو اعلیٰ اسلامی صفات کی طرف متوجہ کریں۔ اسے اخلاقی قدروں کو اپنانے اور اخلاقی ضابطوں کی پابندی پر آمادہ کریں۔ جو تعاون، ہمدردی، مواخاۃ اور خیر خواہی پر اکسائیں، جو عصمت وعفت اور پاک دامنی کی تلقین کریں، اسلامی ادب کا مقصد سماج کو اخلاقی صفات سے مالا مال کرنا ہے تاکہ زندگی کے ہر شعبے میں سماج کے افراد اسلامی ضابطوں کے مطابق روش اختیار کریں۔

نجات اللہ صدیقی کے برادر بزرگ محمد حمید اللہ صدیقی نے جنوری ۱۹۶۰ء میں کراچی سے لکھے گئے اپنے ایک خط میں اسلامی ادب کی صورتحال پر بھی تبصرہ کیا:

> ادھر کافی عرصے سے کم از کم میری دانست میں کوئی معقول مقالہ نہیں لکھا گیا ہے۔ اپنے حلقے سے تو کسی نے لکھا نہیں باہر کے حلقوں کے اسلامی ادب پر بہت پہلے ڈاکٹر شوکت سبزواری اور احسن فاروقی نے مقالات لکھے تھے جس میں ساری بحث اس بات سے تھی کہ اسلامی ادب کیوں نہیں ہوسکتا۔ ڈاکٹر سبزواری کا مقالہ 'مشیر' کے اسلامی ادب نمبر میں شامل ہے۔ احسن فاروقی صاحب کا نقوش میں چھپا تھا، اب وہ پرچہ بھی نہیں ہے۔ ویسے علی گڑھ میگزین کے نظریاتی ادب نمبر میں بھی

بعض مقالات ہیں۔ افتخار اعظمی کا مقالہ تو بہت طویل ہے، میں نے پڑھا بھی نہیں ہے۔ بہرحال اب قلم برداشتہ پچھلے دس سال میں چھپے ہوئے مقالات میں سے چند کا حوالہ دینا بڑا مشکل ہے۔

مقدمہ لکھتے وقت میرے خیال میں ایک بات ذہن میں ضرور رکھنی چاہیے کہ ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۵۰ء تک کے ترقی پسند ادب نے ہمیں کیا دیا اور پھر ۱۹۵۰ء سے اب تک کے نئے ادب نے کیا دیا۔ ترقی پسند ادب کے اس پس منظر میں اور نئے ادب کے بالکل متوازی اسلامی ادب نے کیا دیا۔ اس سلسلے میں پہلا Point تو ہمارے دور کا ذہنی پس منظر ہوسکتا ہے۔ ترقی پسندوں نے مارکس کا پیش کردہ نظریہ تاریخی جبر جوں کا توں قبول کر کے انسان کو مکمل طور پر سماجی حالات کے تابع بنا دیا۔ اور اسی کے متوازی فرائڈ کے نظریات نے انسان کو اپنے تحت الشعور کا غلام بنا دیا۔ یہ دونوں نظریات ترقی پسندوں اور ارباب ذوق کے پیش کردہ ادب میں غالب ہیں۔

ان نقطہ ہائے نظر کے دو اثرات ہوئے۔ مارکس کے نظریات کی بدولت ادب کی سماجی ذمے داریوں کا شعور اِس قدر بڑھا کہ ۴۹ء کی بھمڑی کانفرنس تک آتے آتے فن کار نے یہ سمجھ لیا کہ حقیقت اور پارٹی لائن ایک چیز ہے، اور پھر ادب اور پروپیگنڈہ کی سرحدیں مل گئیں۔ اور اسی کے متوازی فرائڈ کے اثرات کے ماتحت ادب انسان کی ذاتی اور نجی محرومیوں کا عکس بن گیا۔

۱۹۵۰ء سے آگے جو نیا ادب ہے اس میں یہ دونوں باتیں ملتی ہیں۔ ایک طرف ضرورت سے زیادہ جبریت ہے اور دوسری طرف ضرورت سے زیادہ انفرادیت پرستی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ فکری دیوالیہ پن بھی نمایاں ہے۔ بالعموم نئے لکھنے والوں میں سے کسی کے وہاں بھی کوئی معاشرتی فلسفہ نہیں ملتا۔

ان تمام باتوں کے اجمالی ذکر کے بعد اسلامی ادب کو لیا جاسکتا ہے اور یہ بتایا جاسکتا ہے کہ اس ادب نے کیا دیا۔ اسلامی ادب نے ایک بار پھر انسان کو سماج اور تحت الشعور دونوں کی غلامی سے نکالا ہے۔ انسان کے اندرون کو کھنگال کر اس کی تعمیری قوتوں کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے۔ براہ راست انسانی ضمیر کو مخاطب کیا ہے بلکہ اس طرح سے انسانی ضمیر کو Restore بلکہ Resurrect کیا ہے۔ ایک مثبت نظریہ پیش کیا ہے جس کے اندر پورے کا پورا نظام حیات بننے کی صلاحیت موجود ہے۔(۱۴)

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی معتبر اردو ناول نگاروں اور ادیبوں کے علاوہ مشہور و معروف انگریزی ناول نگاروں کی تخلیقات کا بھی سنجیدگی سے مطالعہ کرتے تھے۔ چناں چہ انگریزی کے معاصر فرانسیسی ناول نگار، افسانہ نویس اور ڈراما نگار ڈاکٹر ولیم سمرسیٹ ماگھم

(William Somerset Maugham 1874 - 1965) کے افکار و نظریات کا اسلامی نقطہ نظر سے جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے ایک طویل مضمون تحریر کیا جو ماہ نامہ چراغ راہ (کراچی) کے ستمبر تا دسمبر ۱۹۵۸ء کے شماروں میں قسط وار شائع ہوا ہے۔

ادب سے متعلق سید قطب شہیدؒ کی ایک عربی تحریر کا ''اسلامی ادب کا منہاج'' کے عنوان سے ترجمہ کیا جو ماہ نامہ ''چراغِ راہ'' کراچی میں فروری ۔ مارچ ۱۹۶۰ء کے شمارے میں موجود ہے۔ پروفیسر خورشید احمد کی تصنیف ''تذکرۂ زنداں'' جب ۱۹۶۶ء میں منظرِ عام پر آئی تو نجات اللہ صدیقی نے اس پر ایک مختصر تبصرہ کیا جو ماہ نامہ چراغ راہ میں اگست ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں موجود ہے۔

خاکسار کو ۲۰۱۴ء سے ۲۰۱۸ء کے درمیان نجات اللہ صدیقی سے دہلی اور علی گڑھ میں متعدد ملاقاتوں کا شرف حاصل ہوا۔ انھیں ادارۂ ادب اسلامی کی تاریخ اور اس کے علمی ورثے کو محفوظ کرنے کی فکر ہمیشہ دامن گیر رہتی تھی۔ اپنے رفیق ڈاکٹر عبدالباری (شبنم سبحانی) کے وطن ٹانڈہ میں موجود ادب اسلامی کی سرگرمیوں سے متعلق مواد، رسائل و جرائد، دستاویزات اور کتابوں کے ضائع ہوجانے کا بھی انھیں خدشہ تھا۔

ہندوستان میں اسلامی ادب کی تاریخ کے سنجیدہ مطالعے کے لیے ضروری ہے کہ پہلی فرصت میں ان ادبی رسائل و جرائد اور تصنیفات و تالیفات کو یکجا کیا جائے جو اس حلقے کی جانب سے ابتدا میں شائع ہوئیں۔ کاش ادارۂ ادب اسلامی ہند کے ارباب حل وعقد اپنی سنہری تاریخ کو مرتب کرنے کی فکر کریں اور اس جانب خصوصی توجہ دیں۔ (۱۴)

حواشی وتعلیقات

۱۔ نجات اللہ صدیقی، ''اسلام، معاشیات اور ادب خطوط کے آئینے میں''، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۰ء، ص ۲۲۔۲۴

۲۔ ایضاً، ص ۱۶۶۔۱۶۷

۳۔ نجم الاسلام فاروقی ۱۹۳۳ء میں بجنور (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ میرٹھ کالج سے بی اے کیا تھا۔ عرصے تک ماہ نامہ 'معیار' میرٹھ کے مدیر رہے۔ اسی زمانے میں تعمیری ادب کے ترجمان افسانوں اور ڈراموں کا ایک انتخاب ''ابھرتی کرنیں'' کے نام سے شائع کیا تھا۔ اسلامی ادب کے تصور کی تشریح و تعبیر کے لیے اداریوں کے علاوہ متعدد مقالات لکھے، شاعری بھی کرتے تھے۔ نومبر ۱۹۵۵ء میں مسلم یونی ورسٹی کے یونین ہال میں منعقد ہونے والے ادب اسلامی کے جلسے میں ''ادب اور تنقید کا تعمیر پسند نظریہ'' کے عنوان پر ایک مقالہ پیش کیا تھا۔ پاکستان منتقل ہونے کے بعد سندھ یونی ورسٹی سے ایم اے اور ''شمالی ہند کی قدیم اردو نثر'' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ سندھ یونی ورسٹی کے شعبہ اردو میں استاذ اور صدر شعبہ رہے۔ اپنے شعبے کی جانب سے 'صریر خامہ' کے نام سے ایک ادبی رسالہ جاری کیا تھا۔ ۱۹۸۷ء میں انھی کی ادارت میں شعبہ اردو نے بلند پایہ مجلہ ''تحقیق'' نکالا۔ ''مطالعات'' ان کے تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ۱۳ر فروری ۲۰۰۱ء کو لطیف آباد، سندھ میں وفات پائی۔

۴۔ نجات اللہ صدیقی، ''اسلام، معاشیات اور ادب خطوط کے آئینے میں''، ص ۳۶۳

۵۔ ایضاً، ص ۳۶۱۔۳۶۲

۶۔ محمد نجات اللہ صدیقی، ''اسلامی ادب''، ادارۂ ادب اسلامی ہند، دہلی، ۱۹۶۰ء، ص ۴۵

ڈاکٹر محمد عزیر کی ولادت ۱۹۰۴ء میں اعظم گڑھ کے قصبہ بی بی پور میں ہوئی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے 'ایم اے' اور 'پی ایچ ڈی' کی سند حاصل کی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں شعبۂ اردو میں لکچرر ہوئے۔ دار المصنفین، اعظم گڑھ کے بھی رفیق رہے ہیں۔ سید سلیمان ندوی کی ہدایت پر لکھی گئی ان کی کتاب ''دولتِ

عثمانیہ'' دوجلدوں میں دار المصنفین سے شائع ہوئی۔ دوسری معروف کتاب ''اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ'' انجمن ترقی اردو ہند سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی۔ نومبر ۱۹۵۵ء میں مسلم یونی ورسٹی کے یونین ہال میں منعقد ہونے والے ادبی اجلاس میں 'اسلامی ادب کا منصب' کے عنوان سے ایک مقالہ پیش کیا۔ ماہ نامہ' معارف میں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۸ء تک ہر ماہ پابندی سے لکھا۔' ۱۹۶۶ء میں متقاعد ہونے کے بعد کراچی ہجرت کر گئے اور وہیں جنوری ۱۹۹۵ء میں وفات پائی۔

۷۔ ماہ نامہ ''معیار''، میرٹھ، جلد نمبر ۷، شمارہ نمبر ۱۔۲، مئی ۱۹۵۷ء، لکھنؤ کانفرنس نمبر، ص ۳

۸۔ ایضاً، ص ۱۴۔۱۵

۹۔ ایضاً، ص ۴۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۳

۱۱۔ ایضاً، ص ۶۸

۱۲۔ ایضاً، ص ۹۷

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۳۰۔۳۳۱، محمد حمید اللہ صدیقی (ایم اے) ۱۹۴۷ء میں پاکستان چلے گئے تھے۔ سندھ مسلم کالج کراچی میں انگریزی کے لکچرر رہے۔ کراچی سے شائع ہونے والے ادبی ماہ نامہ ''مشیر'' کے مدیر رہے۔ اسلامی ادب پر متعدد اصولی اور تنقیدی مقالات پیش کیے ہیں جو اس زمانے کے ادبی اور علمی رسالوں میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ موصوف نے افسانے اور ناول بھی لکھے ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں برطانیہ منتقل ہوئے اور ایک اسکول میں انگریزی کے استاذ مقرر ہو گئے۔ ۲۳ر نومبر ۲۰۰۹ء کو برمنگھم کے مضافات میں وفات پائی۔

۱۴۔ جناب انتظار نعیم صاحب نے چند صفحات پر مبنی ایک کتابچے کے ذریعہ ادارۂ ادب اسلامی کا مختصر تعارف کرایا ہے۔ کتابچہ کا نام ہے ''ادارۂ ادب اسلامی کے پچاس سال (مختصر تذکرہ)'' سنہِ اشاعت ۱۹۹۷ء، بارہ دری شیر افگن، بلی ماران، دہلی ۶۔



اردو ادب میں

روحانیت و مادّیت کی کش مکش

(انیسویں صدی میں)

ڈاکٹر تہمینہ عباس

قیمت: ۱۴۰۰ روپے

انجمن ترقیِ اردو پاکستان، ایس ٹی ۱۰، بلاک ۱، گلستانِ جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی

کومل شہزادی ❁

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C, Latifabad, Hyderabad.

''ملّی نغمہ — فن اور روایت'': ایک اجمالی جائزہ

وطن سے محبت اور قومی شناخت کا تعلق بہت گہرا ہے۔ وطن سے محبت ہی وہ جذبہ ہے جو ہمیں اپنی قومی شناخت کے ساتھ جوڑتا ہے اور ہمیں اپنے وطن کے لیے فخر اور وفاداری کا احساس دلاتا ہے۔ وطن سے محبت کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے اس بات پر یقین ضروری ہے کہ وطن ہماری پہچان، ہماری تہذیب اور ہماری ثقافت کا مرکز ہے۔ وطن سے محبت ہمیں اپنی جڑوں سے جوڑتی ہے اور ہمیں اپنے وطن کا ذمے دار شہری بناتی ہے۔ یہ ہمیں ثقافتی ورثے کے ساتھ جوڑتی ہے اور اپنے وطن کی تاریخ اور تہذیب روشناس کرواتی ہے۔ قومی وملّی شاعری سے مراد وہ شاعرانہ تاثرات ہیں جو کسی ملک کی قومی شناخت، ثقافت اور اقدار کی عکاسی کرتے ہیں۔ پاکستان کے تناظر میں قومی وملّی شاعری ملک کے ادبی ورثے کا ایک اہم حصہ ہے۔ یہ تاریخ، روایات واقدار اور مختلف علاقوں اور پس منظر کے لوگوں کے درمیان اتحاد، یکجہتی اور ہم آہنگی کو فروغ دیتی ہے۔ قومی/ملی شاعری میں علامہ اقبال کی تخلیقات جنھیں ''پاکستان کے قومی شاعر'' کہا جاتا ہے، ایک عمدہ ذخیرہ ہیں۔ فیض احمد فیض کی شاعری ملک کی آزادی اور سماجی انصاف کی جدوجہد کی عکاسی کرتی ہے۔

پاکستان اور جنوبی ایشیا میں ملی نغمے کی روایت بہت پرانی ہے۔ یہ قومی موضوعات، تاریخی واقعات، ثقافتی روایات، اور قومی شناخت سے متعلق گیتوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔

قومی وملی شاعری کے متعلق تھامس کیمبل (Thomas Campbell) لکھتا ہے:

"The patriot's blood is the seed of freedom's tree".

''کسی محبِ وطن کا خون آزادی کے درخت کا بیج ہے۔''

ڈاکٹر انصر عباس، یونی ورسٹی آف میانوالی میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ وہ ایک عمدہ محقق، مکارمِ اخلاق استاد اور مصنف ہیں۔ یہ ضخیم کتاب اُن کا پی ایچ ڈی کا مقالہ تھا جو کتابی صورت میں اسی سال شائع ہوا ہے۔ اس کے مطالعے کے بعد میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ یہ کتاب معیاری تحقیق پر مبنی ہے یعنی انھوں نے اپنی تحقیق میں صرف صفحات کو سیاہ کرنا یا ان کی تعداد بڑھانا پیشِ نظر نہیں رکھا بلکہ انھوں نے وہ مواد بھی اس میں شامل کیا ہے جو اس سے قبل کسی بھی کتاب یا اور کسی بھی جگہ موجود نہیں۔ انھوں نے ایسی چیزوں پر تحقیق کی ہے جن پر اس سے پہلے تحقیق نہیں کی گئی تھی۔ تحقیق کا مقصد بھی ان پہلوؤں کو سامنے لانا ہوتا ہے جو اس سے قبل موجود نہ ہوں یا جن کے بارے میں معلومات آسانی سے میسر نہ ہو۔

❁ مکان نمبر ۱۹، الکریم اسٹریٹ، ماڈل ٹاؤن، سیال کوٹ۔ برقی پتا: komalkaleem63@gmail.com

یونی ورسٹی آف میانوالی کے وائس چانسلر ڈاکٹر اسلام اللہ خان لودھی رقم طراز ہیں:

> جو قومیں اپنی دھرتی اور ملک سے محبت کرتی ہیں ان کے ہونٹوں پر وطن کی محبت کے نغمے جاگتے ہیں عالمی سطح پر دیکھا جائے تو دنیا کی ہر زبان میں قومی اور ملی شاعری کے عمدہ نمونے موجود ہیں ڈاکٹر انصر عباس نے اپنی تحقیق کے لیے ایسے موضوع کا انتخاب کیا ہے جو بلاشبہ ہمارے قومی تشخص کی پہچان ہے۔

کتاب کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جس کی تفصیل کے لیے ذیلی ابواب بھی بنائے گئے ہیں۔ ڈاکٹر انصر عباس نے ملی نغمہ نگاری کے بنیادی مباحث میں قوم وملت کا تصور، قوم کا مفہوم، ملت کا خصوصی مفہوم، قومی شاعری کا تصور اور ملی شاعری کا تصور بہت تفصیلی انداز میں قلم بند کیا ہے۔ علاوہ ازیں ملی نغمہ بطور صنفِ سخن، ملی نغمہ: موضوعاتی صنف، ملی نغمہ: ہیتی تنوع، ملی نغمہ اہم موضوعاتی دائرے، بطور صنف ملی نغمہ کا مقام، ملی نغمہ اور پاکستان سے خصوصی تعلق کو بھی انھوں نے احسن انداز میں بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر انصر عباس نے ملی نغمہ نگاری کے بنیادی مباحث کو بڑے تفصیلی انداز میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے قوم، ملت، قومی شاعری اور ملی شاعری کے تصورات کو واضح کیا ہے۔ اردو میں قومی اور ملی شاعری آغاز سے قیام پاکستان تک جس میں انھوں نے عالمی ادب میں قومی شاعری میں قدیم ادب میں قومی شاعری، اقوام عالم میں قومی ترانوں کا سلسلہ اور بیسویں صدی میں عالمی ادب میں قومی شاعری، اردو ادب میں قومی اور ملی شاعری جس میں ابتدائی نقوش (دکن، دلّی اور لکھنؤ وغیرہ) کا بھی بڑے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ۱۹ ویں صدی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء سے پہلے، اردو ادب میں قومی اور ملی شاعری تحریک کے سید احمد بریلوی شہید، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء اور اردو ادب میں قومی اور ملی شاعری، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد اردو ادب میں قومی اور ملی شاعری، بیسویں صدی میں ۱۹۴۷ء سے پہلے اردو ادب میں قومی اور ملی شاعری، آزادی کی تحریکیں اور قومی اور ملی شاعری جس میں انھوں نے علی گڑھ تحریک اور قومی اور ملی شاعری، علی گڑھ تحریک کا ردِعمل اور قومی اور ملی شاعری برطانوی سامراج سے آزادی کی تحریکیں اور قومی شاعری، خلافت کی تحریک اور قومی و ملی شاعری، تحریک پاکستان اور قومی و ملی شاعری، اقبال اور قومی و ملی شاعری، ترقی پسند تحریک اور قومی شاعری اور دیگر تحریکیں کے تناظر میں شاعری میں لکھی گئی شاعری کا بھی انھوں نے عمدہ انداز سے جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر انصر عباس نے قومی و ملی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی بحث کی ہے۔ انھوں نے قومی شاعری کے قدیم ادب میں، اقوامِ عالم میں، بیسویں صدی میں اور اردو ادب میں اس کے مختلف ادوار پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کا ایک باب انھوں نے قیام پاکستان کے بعد قومی و ملی نغمہ نگاری عمومی موضوعات اور افکار جس میں انھوں نے پاکستان کے قیام اسباب ومحرکات، ملتِ اسلامیہ/ اسلامیانِ ہند کے لیے ایک الگ ریاست کا تصور، وطن کے جغرافیائی تصور کی بجائے مذہبی تصور کے ساتھ ربط، قیامِ پاکستان کے بعد ہماری مذہبی شناخت کا حوالہ، تہذیبی خدوخال کے نمایاں پہلو، قومی و ملی شاعری کا نیا رخ، حصولِ آزادی کے بعد حفظِ آزادی، ملی نغمہ نگاری کا آغاز وارتقا جیسے اہم موضوعات پر انھوں نے قومی رہنماؤں پر لکھے گئے شعر پارے، فسادات اور ہجرت، تعمیر ملک وقوم کے حوالے سے عزم کا اظہار، مناظرِ پاکستان کو نمایاں کرنے والے شعر پارے، پاک چین دوستی اور پاکستانی ملی نغمے، پاکستانی شہروں سے

اظہار محبت کے آئینہ دار نغمے، کشمیر اور ملی نغمہ نگاری، اخلاقی روایات کے آئینہ دار نغمے، مذہبی روایات کے آئینہ دار نغمے، وحدت عالم اسلامی اور پاکستانی ملّی نغمے (اسلامی کانفرنس ۱۹۴۷ء) کے تحت لکھے گئے نغموں کے علاوہ سیاسی وسماجی حوالے سے اور مزاحمتی حوالے سے، پاکستان کا قومی ترانہ اور قومی پرچم سے متعلق نغمے انھوں نے بہت عرق ریزی سے تذکرہ کیا ہے۔

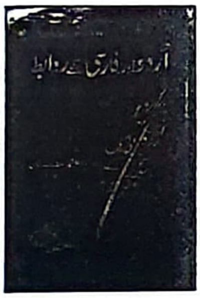
قیامِ پاکستان کے بعد قومی اور ملی نغمہ نگاری عسکری پس منظر میں جس میں انھوں نے جنگ اور شاعری، جنگ کے محرکات، جنگ اور شاعری کا تعلق، اردو میں رزمیہ شاعری کی روایت، پاک بھارت جنگوں کا تسلسل، تنازع کشمیر ایک بنیادی تنازع، پانی ایک اہم تنازع، سیاچین ایک نیا تنازع، جنگ ۱۹۴۷ء، جنگِ کشمیر کے پس منظر میں نغمہ نگاری، جنگ ۶۵ء کے پس منظر میں نغمہ نگاری، جنگ ۱۹۷۱ء اور سقوطِ ڈھاکہ کے پس منظر میں نغمہ نگاری، تنازعِ سیاچن اور ملی نغمہ نگاری، معرکہ کارگل اور ملی نغمہ نگاری نیز افغان روس جنگ، افغان امریکا جنگ اور عراق امریکا جنگ کے حوالے سے ملی نغمہ نگاری کا تفصیلی طور پر جائزہ لیا ہے۔ پاکستان میں دہشت گردی کے تناظر میں لکھے گئے جو ملی نغمے تھے جن میں سانحہ پشاور، معرکہ بڈبیر اور اس کے علاوہ جو واقعات دہشت گردی کے پاکستان میں ہوئے اس تناظر میں لکھے گئے ملی نغموں کا بھی تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

آخری باب میں انھوں نے قیامِ پاکستان کے بعد قومی و ملی نغمہ نگاری کا فنی اور اسلوبیاتی مطالعہ کیا ہے جس میں انھوں نے نغمہ نگاری کے فن کے حوالے سے بحث کی ہے جس میں ہیئتی تنوع، روایتی ہیئتیں مثلاً غزل، مثنوی، قطعہ وغیرہ، متفرق ہیئتیں، آزاد نظم، تمام ہیئتوں کے حوالے سے اردو میں نغمہ نگاری کا مطالعہ کیا ہے۔ نغمہ نگاری میں اسالیب کا تنوع اس کا بہت عمدہ انداز میں جائزہ صفحۂ قرطاس پر اتارا ہے۔ اسالیب کا تنوع میں مغربی اسلوب، مفرس اسلوب، ہندی آمیز اسلوب، رواں دواں اسلوب، سلیس اردو زبان اس کے علاوہ علم بیان، تشبیہ، استعارہ مجاز مرسل وغیرہ، علم بدیع: صنائع لفظی وصنائع معنوی، امیجری، تصویر کاری، تمثالیت، نغمگی، خوش آہنگی، غنائیت اس کے علاوہ الفاظ وتراکیب کا استعمال، متنوع بحروں کا استعمال کے حوالے سے گہرا مطالعہ کیا ہے۔ نغمہ نگاری کی روایت کے حوالے سے جو لکھا ہے، اس سے ان کی تحقیق کا علم ہوتا ہے اور جو فن اور اسلوب کے حوالے سے لکھا ہے اس سے ان کی ذہانت اور مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو فن کے اوپر عبور حاصل ہے۔ ڈاکٹر انصر عباس نے نہ صرف ملی نغمے کی پرتیں کھولی ہیں اور احسن انداز میں اس کا تعارف کروایا ہے بلکہ تاریخی واقعات اور سانحات کے حوالے سے جو مثالیں بیان کی ہیں، وہ قابلِ داد ہیں۔ یہ کتاب اردو ادب میں ملی وقومی شاعری کے موضوع پر ایک جامع ومفصل مطالعہ پیش کرتی ہے۔ ڈاکٹر انصر عباس نے ملک کے ثقافتی ورثے کے تحفظ، قومی یکجہتی کو فروغ دینے اور حب الوطنی کو متاثر کرنے میں ملی وقومی شاعری کی اہمیت کا احاطہ کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد چند سوالات ذہن میں آتے ہیں کہ جدید دور میں ملی وقومی شاعری کے کردار کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا یہ اب بھی قومی فخر اور اتحاد کی اسی سطح کو ابھار سکتا ہے جیسا کہ ماضی میں تھا؟

پاکستانی معاشرے کے مختلف طبقات ملی نغمے کو کس طرح سمجھتے اور اس کی تشریح کرتے ہیں؟ اگر کوئی ان سوالات کو تلاش کرکے، محققین پاکستان میں ملی نغمے کی اہمیت اور ملک کے ثقافتی اور قومی تشخص کی تشکیل میں اس کے کردار کے بارے میں گہرائی سے سمجھنا چاہتا ہے تو اس کتاب میں ان تمام سوالات کے جوابات مل جائیں گے۔

المختصر، جامعاتی تحقیق میں جبکہ آپ کے پاس وقت محدود ہو اور آپ کو پابندیوں کی حد میں رہ کر اپنا کام سمیٹنا ہے تو آپ کے پاس محدود ذرائع ہیں ماخذات کی تلاش میں سفر بھی کرنا ہے مصاحبے اور مکالمے کی بھی ضرورت پڑتی ہے، کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک ایک دانہ اکٹھا کرنا ہے بعض اوقات آپ سات سو صفحات کھنگال لیتے ہیں اور آپ کو اپنے مقصد کی ایک بھی سطر نہیں ملتی سو ایسے حالات میں مایوسی بھی اپنا گھیرا تنگ کر لیتی ہے تو محقق کو اس میں جو کچھ ملتا ہے اسی پر اکتفا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے ان حالات کے تحت ڈاکٹر انصر عباس نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے بھرپور کوشش کی اور وقت کو استعمال کرتے ہوئے مقالے کو بہتر سے بہتر بنایا۔ امید ہے کہ جو کام انھوں نے کیا ہے وہ محقق کے طور پر اپنی الگ پہچان بنانے میں کامیاب ہوں گے اور اپنی اس تصنیف کو مستند اور اہم بنانے کے لیے تحقیقی اصولوں کے مطابق حوالہ جات بھی شامل کیے ہیں۔ یہ کتاب اہم اور معتبر حوالہ ثابت ہوگی۔ ڈاکٹر انصر عباس کا اسلوبِ نگارش نہایت سادہ، شگفتہ اور دل کش ہے، پڑھنے والا تحریر سے اکتاتا نہیں اور اگر قاری کا تعلق ادب سے استوار ہے اور ایسی تحریروں کے پڑھنے میں دلچسپی رکھتا ہے تو وہ اس صاف ستھری زبان اور انداز سے پورا استفادہ کرتا ہے۔

اردو اور فارسی کے روابط



(دوسری اشاعت)

ڈاکٹر محمد عطاء اللہ خان

قیمت: ۱۰۰۰ روپے

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی اردو خدمات



ڈاکٹر صوفیہ یوسف

قیمت: ۸۰۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ایس ٹی ۱۰، بلاک ۱، گلستانِ جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، کراچی

رفتارِ ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C, Latifabad, Hyderabad.

وقت سے ماورا محبت (افسانے)

مصنف : منصور الظفر

صفحات : ۶۸۰، قیمت: ۵۰۰ روپے

ناشر : الحمد پبلی کیشنز، گلشن اردو بازار، گلشنِ اقبال، بلاک ۳، مین راشد منہاس روڈ، کراچی

مبصر — غلام محی الدین

منصور الظفر داؤد۔ عجب مخمصے میں ہوں کہ انھیں کس خانے میں فٹ کروں کہ وہ ماہرِ تعلیم ہیں، شاعر ہیں، افسانہ نگار ہیں، محقق ہیں۔ ہر شعبے میں اُن کی قابلیت کا چراغ اِس طرح روشن ہے کہ جہاں تک اُس کی تابانی جاتی ہے، اندھیرے چھٹ جاتے ہیں۔

منصور الظفر داؤد سے ذاتی تعارف تو نہیں لیکن ان کی تحریروں، شاعری اور اُن کے خاندان کے حوالے سے ایک مثبت تصور ذہن میں ہمیشہ سے رہا، البتہ اس تعارف کے بعد جب ان کی تحریریں نظر کے سامنے سے گزریں تو یہ احساس خوشگواری میں بدل گیا کہ ابھی ہمارے وطنِ عزیز میں علم و ادب کا میدان زرخیز ہے۔ اس وقت میری نظروں کے سامنے ان کے افسانوی مجموعہ ''وقت سے ماوراء محبت'' کا مسودہ ہے۔ کہنے کو تو یہ مختصر افسانے ہیں لیکن احساس کے کینوس پر ان افسانوں میں ہمارے معاشرے کی اچھائیاں، برائیاں، یقینی اور بے یقینی، محبت، دوستی، غرض بے شمار معاشرتی اور نفسیاتی پہلو اس خوبی کے ساتھ اُجاگر کیے گئے ہیں کہ قاری خود کو کہانی کا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ کتاب میں شامل افسانے ''دو خواب، ایک زندگی'' کا صرف ایک جملہ ملاحظہ کیجیے، اِس سے کتاب کی مقصدیت اور قدر و قیمت کا اندازہ با آسانی ہو جائے گا:

> بیٹا، شاعری اچھی چیز ہے، مگر زندگی کی ضمانت نہیں دیتی، تمھیں ایک کامیاب انسان بننا ہے، جو اپنے گھر والوں کے لیے فخر کا باعث بنے، انجینئرنگ میں شان دار مستقبل ہے۔ ہمیں تم سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

’’درد کا سفر‘‘ قاری کے دل اور ذہن کو اپنی گرفت میں لے کر جھنجھوڑ دیتا ہے، اقتباس دیکھیے:

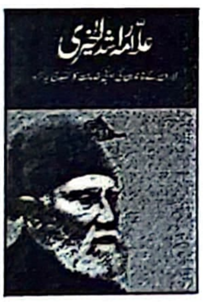
> اور پھر......درخت کے نیچے بیٹھی ایک بے بس ماں...... ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔اگلی صبح، پارک کے مالی نے جب درخت کے نیچے پڑے اس بے جان وجود کو دیکھا، تو قریب آیا۔ایک بوڑھی ماں......جس کا کوئی نام نہ تھا،کوئی پہچان نہ تھی......بس ایک چہرہ تھا،جس پر محبت کی لکیر تھی، اور بے وفائی کی گرد جمی تھی۔اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر لگی:’’ایک بوڑھی خاتون کی لاش پارک میں ملی،کوئی وارث نہ ہونے کے باعث سرکاری کفن دفن کر دیا گیا۔

اُن کے دیگر افسانوں میں اور بھی بہت سے حقیقت سے قریب تر اور چونکا دینے والے جملے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ منصور الظفر داؤد صاحب کے پیش نظر صرف افسانہ نگاری محض افسانہ نہیں ہے بلکہ ایک پیغام بھی ہے۔

منصور الظفر داؤد صاحب کی زندگی پر نظر ڈالیں تو ان کا کیریئر بھی اس بات کا غماز ہے کہ انھوں نے شاعری کی ہے یا افسانہ نگاری، یا پھر ان کی پروفیشنل اور ذاتی زندگی، اس کا ایک مقصد ہے اور مقصد بھی وہ جو عبادت کے درجے تک جا پہنچتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کے قلم کو مزید روانی اور طاقت بخشے کہ اِس دور میں اچھا اور بامقصد لکھنے والے کم ہی نظر آتے ہیں ۔منصور الظفر داؤد صاحب کا نام ہمیشہ ہی اچھا لکھنے والوں میں شمار کیا جائے گا۔

❁❁❁



علامہ راشد الخیری
اور اُن کے خاندان کی
ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر داؤد عثمانی

قیمت: ۱۳۰۰ روپے

انجمن ترقیِ اردو پاکستان، ایس ٹی ۱۰، بلاک ا، گلستانِ جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی

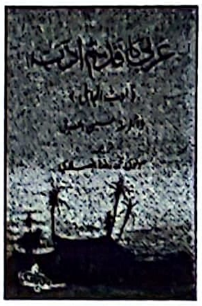
گرد و پیش

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C. Latifabad, Hyderabad.

خبریں

- فلسطینی ادیبہ وصحافی یاسمین زاہر نے اپنے پہلے ناول *The Coin* پر ڈیلن تھامس انعام (Dylan Thomas Prize) جیت لیا ہے۔ مذکورہ انعام نوجوان ادیبوں کو دیا جانے والا سب سے قدیم ادبی انعام ہے جو یونی ورسٹی آف سوانزی (ویلز، برطانیہ) کی جانب سے دیا جاتا ہے۔ یاسمین ۱۹۹۱ء میں فلسطین میں پیدا ہوئیں۔ اُنھوں نے امریکا سے بائیومیڈیکل انجینئرنگ میں بیچلرز اور فائن آرٹس میں ماسٹرز کی اسناد حاصل کیں۔ یاسمین اس وقت واشنگٹن میں ایک خبر رساں ویب گاہ ''المونیٹر'' کے لیے صحافتی خدمات انجام دے رہی ہیں۔
- محبانِ آصف فرخی اور کوہی گوٹھ پبلی کیشنز، کراچی کی جانب سے ۲۰۲۵ء کے ''آصف فرخی علم و آگہی ایوارڈ'' کے لیے ذکی نقوی کے افسانوں کے مجموعے ''دیار و دشت'' اور بدر ابڑو کی آپ بیتی ''جوڳي ٿي جيئاس'' کا انتخاب کیا ہے۔ اس ایوارڈ کے اجرا تقریباً رواں ماہ میں منعقد کی جائے گی۔ مذکورہ ایوارڈ کا اجرا ۲۰۲۱ء میں آصف فرخی صاحب کی پہلی برسی کے موقعے پر کیا گیا تھا کا مقصد اردو اور سندھی میں شائع ہونے والی طبع زاد کتابوں کی پذیرائی ہے۔

❀❀❀



عربی کا قدیم ادب

ڈاکٹر طٰہٰ حسین المصری

ترجمہ: مولوی محمد رضا انصاری

قیمت: ۱۲۰۰ روپے

انجمن ترقیِ اردو پاکستان، ایس ٹی ۱۰، بلاک ۱، گلستانِ جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی

بارے کچھ اپنا بیاں ہو جائے

سیّد عابد رضوی (مدیرِ منتظم)

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C, Latifabad, Hyderabad.

اس بات کا ادراک کیا گیا ہے کہ اس صفحے پر ہمارے تمام معزز قارئین و ناقدین کی مثبت یا تنقیدی آرا جو کہ ہمارے شمارے کو بہتر سے بہتر بنانے میں ممد و معاون ہوں، یہاں بلا کم و کاست شائع کی جائیں۔ فی الحال ابتداً چند اہلِ علم و دانش کی آرا پیش کی جا رہی ہیں۔ (مدیرِ منتظم)

صاحبو! وقت کتنا سرعت رفتار ہے۔ ابھی کچھ ہی عرصہ تو گزرا کہ ہم جذبۂ محبت و اخوت کے فروغ کی خاطر ایک دوسرے کو سالِ نو کی آمد کی مبارک بادیں دے رہے تھے۔ نیا سال نئے ولولے، نئی امیدیں، نئی توقعات اور آنکھوں میں مستقبل کے سنہرے خواب سجائے آتا ہے اور لیجیے، ابھی کچھ بھی نہ ہو پایا تھا کہ دیکھتے دیکھتے سال ۲۰۲۵ء کا چھٹا مہینا یعنی جون آن پہنچا۔

ماہِ جون کی وجہِ تسمیہ اور دیگر تفصیلات ہم گزشتہ برس تحریر کر چکے، اب اس کو دُہرانا کیا۔ ہاں یادش بخیر، حضرتِ قائدِاعظم کے بنا کردہ انگریزی اخبار ''ڈان'' میں یکم جون ۲۰۲۵ء کی اشاعت میں ۷۵ برس قبل یعنی، یکم جون ۱۹۵۰ء کی ایک اہم اور تاریخ ساز خبر نے روح میں سرخوشی کی لہر دوڑا دی، جب ہمارے اُس وقت کے عروس البلاد شہر کراچی میں، اخبار ''ڈان'' نے ایک انقلابی قدم اٹھایا اور لائنو ٹائپ سیٹ اور روٹری پرنٹڈ ''ڈان اردو'' کا آغاز ہوا۔ اس جشن کے موقعے پر کراچی کے قدیم سینٹرل ہوٹل میں، پاکستان ہیرالڈ لمیٹڈ کے مینجنگ ڈائریکٹر جناب محمود ہارون نے ایک پُرتکلف چائے کی محفل سجائی۔ مدعوئین میں عمائدینِ شہر کے علاوہ، ممتاز ترین شخصیت بابائے اردو مولوی عبدالحق کی تھی جنھوں نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ اردو کی ترقی کا تعلق خطِ نسخ کی مقبولیت سے ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ میں نے اپنی زندگی اس مشن کے لیے وقف کر دی تھی وہ ہمیشہ خطِ نسخ کو اپنانے کی وکالت کرتے آئے ہیں اور وہ خوش ہیں کہ ان کی زندگی کا خواب اس وقت شرمندۂ تعبیر ہوا جب ''ڈان اردو'' خطِ نسخ میں منظرِ عام پر آیا جسے یکم جون کے دن کامیابی سے ہم کنار کیا گیا۔ جناب محمود ہارون نے اپنے خیر مقدمی کلمات میں کہا تھا کہ ''ڈان'' پاکستان کا پہلا روزنامہ ہے جسے جدید میکانکی آلات کے ساتھ تیار کیا گیا۔ نیز یہ کہ ''ڈان اردو''، اردو زبان کی ترقی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے کوشاں ہے اور انھیں امید واثق ہے کہ اردو جلد ہی دنیا کی دیگر ترقی پسند زبانوں میں باعزت مقام حاصل کرنے کا فخر حاصل کرے گی۔ (ماخوذ ''ڈان'' انگلش)۔

آپ کو یاد ہوگا کہ انجمن نے بابائے اردو کے دیرینہ خواب کی تکمیل اور اردو کو ڈیجیٹل دنیا میں متعارف کرانے کے لیے، ۲۷ر جنوری ۲۰۲۲ء کو NED یونیورسٹی کے شعبۂ کمپیوٹر سائنس کے ساتھ ایک منصوبہ بنایا تھا جس کے لئے انجمن کی گرانٹ کی رقم سے ایک گراں قدر رقم مختص کی گئی تھی۔ یونیورسٹی کو اخراجات کے لئے خطیر رقم کے علاوہ، پروجیکٹ کے لئے بہت قیمتی آلات بھی خرید کر دیے گئے تھے، انجمن کے عاملین کی محنت شاقہ اور یونی ورسٹی کے طلبہ کی تکنیکی مہارت سے یہ منصوبہ ۸ ماہ میں تکمیل ہونا تھا مگر کسی نہ کسی تکنیکی

دشواری کی بنا پر یہ منصوبہ ۲۰۲۴ء تک بھی توقعات کے مطابق پورا نہ ہوسکا تو باہم گفت وشنید اور ہمارے انتہائی محترم، سابق شیخ الجامعہ ڈاکٹر سروش حشمت لودھی کی مداخلت پر، اور صدر انجمن کی رضامندی سے NED یونیورسٹی نے اب تک کا کام اور ہمارا ساز وسامان ہمیں واپس کر دیا جس کے بعد جنوری ۲۰۲۵ء میں ایک اور ادارے کے ساتھ ملکر اس کام کو پورا کرنے کے لیے معاہدہ کیا گیا اور اب توقع ہے کہ اس منصوبے کا پہلا مرحلہ یعنی ''اردو متن آواز میں'' اس ماہ کے اواخر تک، ایک تقریب میں ماہرین کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

جون کی ۷ تاریخ کو پاکستان میں عید الاضحیٰ روایتی جوش وخروش سے منائی جائے گی۔ ایک عجب مسئلہ فقیر کو مخمصے میں ڈالے رکھتا ہے کہ براہِ راست ٹیلی وژن کی نشریات سے ہم دیکھتے ہیں، حجاجِ کرام عرفات سے منیٰ پہنچ گئے ہیں اور حج کی سعادتوں سے مالا مال ہو چکے مگر ہمارے وطن میں ہمارے چاند کے حساب سے حج دوسرے دن ہوگا جب کہ حج ایک دن قبل ہو چکا۔ خیر یہ تو علمائے کرام و فقیہانِ عالی مقام و مجتہدین عظام کے سلجھانے کا مسئلہ ہے۔ ہم تو جمہور کے ساتھ ہیں کہ ''تم بھی چلے چلو میاں جب تک چلی چلے۔''

قارئینِ ذی وقار، ناصر کاظمی نے ایک بار کہا تھا کہ رات تخلیق کی علامت ہے۔ سورج کی حدت سے پھل پکتے ہیں، مگر رات میں چاند کی کرنوں سے ان میں رس آتا ہے۔ رات کو خوشبوئیں جنم لیتی ہیں اور فضا میں بکھر جاتی ہیں۔ سمندر کی لہروں میں تموّج راتوں کو ہوتا ہے حتیٰ کہ عرش سے آسمانِ دنیا پر فرشتوں کا نزول بھی راتوں کو ہوتا ہے۔ سو یہ عاجز، اس کو شب زندہ دار تو خیر کیا کہیں، ہاں رتجگوں کا عادی، غبی طالب علم بھی رات کے پچھلے پہروں میں، آپ کی تفننِ طبع کے لیے خامہ فرسائی کرنے کی کاوشِ پیہم کرتا ہے اور جو کچھ ہذیان، خیالات کی شکل میں، اس بے دماغ کے دماغ میں خلل انداز ہونے کی سعی کرتا ہے، اس کو خودحرکاتی و بے اختیاری عمل کی برکت سے انگلیوں کی پوروں کے ذریعے موبائل برداشتہ کر کے رات ہی رات میں اپنے کمپوزر صاحب کی طرف ترسیل کر دیتا ہے تاکہ دوسرے دن شمارے کی زینت بن سکے۔

اس بات کا فقیر کو ادراک ہے کہ طلسماتی گفتگو، یا پُرمغز تحریر، گہرے مطالعے اور عمیق غور وفکر کے بغیر ممکن نہیں۔ سو اس کوتاہ قلم کو اپنی عجز بیانی کا اعتراف ہے اور وہ لفظوں کی قوسِ قزح بنانے کے ہنر سے ناآشنا ہے مگر اس بات کا بہت خیال رکھتا ہے کہ:

قلم محاسبہ ایسا اگر میں جھوٹ لکھوں
ردیف تنگ کرے قافیہ ستانے لگے

(آپ کہیں گے کہ ہماری نثر میں قافیہ ردیف کہاں سے در آئے نہ ہی تحریر مقفع و مسجع ہے)

جناب فیض احمد فیض نے کسی موقعے پر فرمایا تھا کہ، ''شاعری سمیٹنے اور نثر بکھیرنے کا نام ہے۔ نثار اپنی تحریر کو اتنا نہ پھیلائے کہ قاری کو بوریت محسوس ہونے لگے۔'' جناب آلِ احمد سُرور نے ایک مکتوب میں اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ، ''اپنے بارے میں لکھنے کو جی چاہتا ہے مگر فرصت کہاں سے لاؤں۔'' اِدھر حال یہ کہ دنیا بھر کی حماقتوں میں گھرا ہوا ہوں اور ان حماقتوں کو سعادت سمجھنے کی کوشش میں مصروف، کم وبیش یہ ہی حال اس خود ساختہ ادیب کا بھی ہے، انجمن کے مختلف الانواع مسائل، مالیاتی و انتظامی امور کی چھان پھٹک، اک اک قدم پر خود احتسابی کے عمل سے اپنے کو گزارنے کا عمل، مالیاتی امور میں شفافیت کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار،

انجمن کی نیک نامی کو کسی طور بٹہ نہ لگنے دینا، ''قومی زبان'' کا پابندی سے ہر ماہ اجرا، تحقیقی مجلّہ ''اردو'' کے لیے مقالوں کی اشاعت، محترمہ زاہدہ حنا کی ناسازیِ طبع کی وجہ سے نئی کتابوں اور مقالات پر مقدمے لکھنا اور پھر اپنی بے بضاعتی کا احساس، ذاتی کم زوریاں جو ہر ایک میں کچھ نہ کچھ ہوتی ہیں، مجھ میں ذرا زیادہ ہیں اور پھر علالت کے باوجود دفتر میں روزانہ حاضر ہونا:

آغشتہ ایم ہر سر خار بخون دل
قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم

صاحب ''نہج البلاغہ''، بابِ مدینۃ العلم کا فرمان ہے کہ اپنے رفیق، اپنے دوست کو، انتہائے صدقِ دل سے، اپنی توفیقات بھر، بہترین مشورے سے نوازو (اس کی بھلائی کے لیے) ہر چند کہ وہ اسے ناگوارِ خاطر ہو۔

مگر کل جگ ہے، نیکی اور سچائی کی باتیں ہر ایک کو کہاں راس آتی ہیں، لوگ اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک تاویل لاتے ہیں کہ لاجواب کر دیتے ہیں۔ حضرت علامہ رشید ترابی نے کیا خوب کہا تھا کہ:

امرِ باطل پہ ہے مطلوب تتبع ہم سے
پھر اسی بات پر چھڑ جائے تنازع ہم سے

مگر یہ بھی تو ایک سیانے کا اعتراف ہے کہ:

حق پرستی ہے بڑی چیز مگر
روز کس کس سے لڑا کیجیے گا

صاحبانِ عالی مرتبت، فارسی میں بھی ایک قول مشہور ہے کہ:

سگ باش برادرِ خورد مباش

آج کل دستور میں اپنے مطالب کے لیے آئے دن ترامیم ہوتی رہتی ہیں تو ہم نے بھی مذکورہ بالا قول میں تھوڑی سی ترمیم یوں کر لی کہ:

سگ باش خازن مباش

وہ یوں کہ خازن اور خائن ہم وزن ہیں مگر معنی میں زمین و آسمان کا بُعد ہے۔ خازن کی نوکری بڑی سولی کی روٹی ہے۔ ذرا چوکے تو کالے پانی کی سزا پائے۔ بات مانے تو مشکل، نہ مانے تو اور زیادہ مشکل۔

تفاسیر میں مرقوم ہے کہ قارون اپنے وقت کا روئے زمین پر مال دار ترین شخص تھا، اس کے خزانوں کی کنجیاں کئی کئی اونٹوں پر بار ہوتی تھیں۔ جانے کیوں کر سنبھالتا ہوگا، ہم سے تو انجمن کے محض چند کروڑ روپے نہیں سنبھالے جاتے، ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ کہیں کچھ غلط نہ ہو جائے۔

انجمن کی تاریخ گواہ ہے کہ مشاہیر و نامی گرامی عہدے داروں کے ہوتے ہوئے، انجمن کے مخطوطات کے ذخیرے سے کئی مخطوطات مفقود الخبر ہوئے، انجمن کے خزانے میں غبن ہوئے۔ سو ہم نے اپنی حلف کی پاس داری میں، اپنے عہدِ خزانہ برداری میں

ادارے کی نیک نامی برقرار رکھنے کی ہر شعوری کوشش روا رکھی۔ ممکن ہے ہماری اس محتاط روی سے ہمارے ہم جلیسوں کو ٹھیس پہنچی ہو۔

مگر خازن کی حیثیت میں فقیر کا سابق صلاح کار ومشیر محصولات (انکم ٹیکس/کسٹم ڈیوٹی/سیلز ٹیکس) اور بنکوں کے مقادم، کسٹم کلیرنگ وشپنگ ایجنٹ ہونے، کسٹم ٹیرف ودرآمدی وبرآمدی پالیسیوں، اورسب سے بڑھ کر پیپرا کے مکمل قواعد وضوابط، ایف بی آر اور ریونیو بورڈ سندھ کے حکام بالا سے دیرینہ روابط کی بنا پر ۲۰۱۹ء سے آج تک، تمام قواعد وضوابط کی پابندی کرتے ہوئے گرانٹ کا حصول ممکن رہا۔ ہر دفعہ انجمن کے اکاؤنٹ صحیح طور پر بنائے جانے کی وجہ سے اداروں میں پاس ہوتے رہے۔ ہاں کبھی کبھی دروں خانہ ضرور ایسا ہوا کہ ہماری قواعد کی پابندی پر اصرار کی وجہ سے مگر ''اپنے بھی خفا ہم سے اور بیگانے بھی ناخوش، مگر میں کیا کروں کہ ''زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند۔''

جون کی تین تاریخ، عالم اسلام کی ایک عہد ساز شخصیت، ایران کے آیت اللہ العظمیٰ روح اللہ خمینی کی وفات کا دن ہے۔ انھوں نے ایران کے ایک مذہبی گھرانے میں ۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۲ء آنکھ کھولی۔ علوم دینی وفقہی کی تکمیل کے بعد مجتہد کے درجے پر فائز ہوئے۔ ان کے تبحر علمی وفضل کو دیکھتے ہوئے ان کو آیت اللہ کا لقب دیا گیا۔ ۱۹۶۴ء میں، امریکی فوجیوں کو ایرانی قوانین سے مستثنیٰ قرار دینے کے خلاف ان کے احتجاج کرنے پر شہنشاہ کی حکومت نے ان کو جلاوطن کر دیا۔ وہ فرانس چلے گئے اور اپنی تقاریر کے ذریعے ایرانیوں کے اذہان میں انقلاب برپا کرتے رہے۔ پندرہ برس کی جلاوطنی کے بعد ۱۹۷۹ء میں وہ ایران واپس آئے اور شاہ کی امریکا نواز، مضبوط ترین حکومت کا تختہ الٹ دیا اور ایران کو اسلامی جمہوریہ بنا دیا۔ اللہ اُن کی روحِ پُرفتوح کی مغفرت فرمائے۔ آمین

ماہِ جون ہی کی ۲۵ تاریخ کو سنہ ۱۹۴۴ء میں، غیر منقسم ہندوستان میں، عالمِ اسلام کے ایک اور بطلِ جلیل، عاشقِ وفدائے محبوبِ کبریا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، بے مثل خطیب، لسان الملّت کے خطاب کے حامل، نواب بہادر یار جنگ نے حیدر آباد دکن میں ۳۹ برس کی عمر میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

بہادر یار جنگ حیدر آباد دکن میں ۳؍فروری سنہ ۱۹۰۵ء کو نواب نصیب یاور جنگ کے بیت الشرف میں تولد ہوئے۔ ان کے اجداد افغانی قبیلے کی سدوزئی شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے جدِ اعلیٰ جن کا نام بھی محمد بہادر خان تھا، احمد شاہ ابدالی کے زمانے میں ہندوستان آئے اور ریاست جے پور کی ایک بستی میں سکونت اختیار کی۔ نواب سکندر جاہ کے عہدِ حکومت میں حیدر آباد دکن آئے۔ مرہٹوں کی شورش کے زمانے میں حکومتِ وقت کا ساتھ دیا۔ اس کے عوض کئی لاکھ کی جاگیر، دو ہزار سوار اور خلعت واعزازات سے نوازے گئے۔ آصف جاہی سلاطین سے ان کی وفاداریاں ہمیشہ غیر متزلزل رہی۔

عالمِ شیر خواری میں والدہ انتقال کر گئیں تو نانی کے سایۂ عاطفت میں چلے آئے۔ دینی علوم کی تحصیل میں آپ نے اس وقت کے جید علما کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ذہین تھے۔ بہت جلد مہارتِ تامہ حاصل کر لی۔ دنیاوی تعلیم کے لیے، شہر کی ان درس گاہوں میں داخل کیے گئے جہاں نوابین وامرا کے بچے بالے تعلیم پاتے تھے۔ مگر شومیِ قسمت کہ ابھی میٹرک میں ہی تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور ان کو تعلیم ادھوری چھوڑ کر، آبائی جاگیر کا انتظام وانصرام سنبھالنا پڑا۔

سنہ ۱۹۳۱ء حج بیت اللہ سے مشرف ہونے کے بعد اس وقت کے کُل بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کی۔ خواجہ حسن نظامی آپ کو

''ابنِ بطوطۂ ہند'' کے لقب سے پکارتے تھے۔ نواب صاحب نے تبلیغِ اسلام کو مشن بنایا۔ ان کی شخصیت میں بلا کی دل کشی تھی۔ بقول محمد عبدالہادی صدیقی، وہ جمال و جلال کی رعنائیوں کا پیکر تھے۔ وقتِ جلال کوہِ آتش فشاں اور جمال میں نرم و سبک رو یا علامہ اقبال کے اس شعر کے بموجب:

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

گزشتہ مہینا بڑی آزمائشوں کا تھا۔ ہمارے ہم سائے نے کسی عالمی سازش کے تناظر میں ہم پر دہشت گردی کا خودساختہ الزام، بنا کسی ثبوت کے لگا کر، اپنی فوجوں اور سرمائے کی کثرت سے ہم پر جنگ مسلط کرنا چاہی مگر ہمارے ۲۴ کروڑ عوام ایک قوم بن کر، سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے اور ہماری بہادر افواج نے، زورِ ایمانی کے بل بوتے پر جرأت کے وہ عظیم الشان کارنامے دکھائے کہ دشمن کے دانت ہر محاذ پر کھٹے کر دیے اور آج جو ہم اپنے بستروں میں چین کی نیند سوتے ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے وطن کے بانکے، سجیلے، طرح دار محافظ، ہماری بری، فضائی اور سمندری فوج کے افسر و جوان ہماری حفاظت کی خاطر جاگتے ہیں۔

عزیزانِ محترم، جیسا کہ ہم اپنے گزشتہ صفحات میں تحریر کر چکے کہ ہماری منتخب مجلسِ منتظمہ کی دوسری باری بھی بخیر و خوبی اختتام کو پہنچی اور اب صدرِ انجمن اپنے دستوری اختیارات استعمال کرتے ہوئے مجلسِ نظما کو نئے چناؤ کے لیے مدعو کریں گے۔

ہم حکومتِ سندھ کے محکمۂ اسکول ایجوکیشن کے وزیر سیّد سردار علی شاہ صاحب اور سیکریٹری تعلیم و سیکریٹری خزانہ بالخصوص جناب شہاب الدین قمر صاحب و دیگر افسران کا صمیمِ قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ان کے تعاون سے ملنے والی گرانٹ کی رقم سے انجمن اپنے منصوبے پایۂ تکمیل تک پہنچاتی ہے۔

مولوی عبدالحق کیمپس کی انجمن کی عمارت کی تزئین و آرائش کا کام مکمل ہو گیا ہے۔ اردو باغ، گلستان جوہر میں بابائے اردو کا گوشہ قائم کر دیا گیا جس میں بابا سے متعلق قدیم اشیا و نوادرات رکھے گئے ہیں۔ اردو باغ سے ملحق، اُجڑی ہوئی، بے مصرف زمین پر طالب علموں کے بیٹھنے، اور تقریبات کے انعقاد کے لیے خوب صورت لان اور شجر کاری کا آغاز ہو چکا ہے، مہمانوں اور اساتذۂ کرام کی گاڑیوں کی پارکنگ کے لیے جگہ مخصوص کر دی گئی ہے۔

اس ماہ کی ۲۷/ جون سے نیا ہجری سال غم و آلام کے ایام یعنی فدیناہ بذبح عظیم کی یاد میں، محرم کی آمد سے شروع ہو جائے گا اور میں سید عابد رضوی جناب اختر عثمان کے ان دو شعروں کی تشریح میں الجھ کر رہ جاتا ہوں:

جب روح سے کہتے ہو کہ لبیک حسینا   پھر دل سے یزیدوں کا یہ ڈر کیوں نہیں جاتا
کہتے ہو کہ ہو اسوۂ شبیر پر قائم   دربار میں کیوں جاتے ہو سر کیوں نہیں جاتا

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C. Latifabad, Hyderabad.

❀❀❀

انجمن کی تازہ مطبوعات

فون (شعبۂ فروخت): ۰۳۳۲-۲۷۹۰۸۴۳

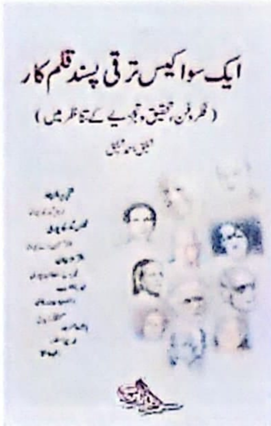
۱۔ اردو صحافت: ابتدا و ارتقا	مرتبہ: ڈاکٹر طاہر مسعود	۱۴۰۰ روپے
۲۔ ایک سو اکیس ترقی پسند قلم کار	شفیق احمد شفیق	۳۵۰۰ روپے
۳۔ العالم الاسلامی	بابائے اردو مولوی عبدالحق	۸۵۰ روپے
۴۔ ''اُس نے کہا'' کا تنقیدی و تحقیقی مقالہ	ڈاکٹر احمد محمد احمد عبدالرحمٰن القاضی	۷۰۰ روپے
۵۔ علامہ شبلی اور انجمن ترقیِ اردو	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	۸۰۰ روپے
۶۔ اردو ادب میں روحانیت و مادّیت کی کش مکش	ڈاکٹر تہمینہ عباس	۱۴۰۰ روپے
۷۔ منقبتی و رثائی ادب اور اردو شاعرات	تسنیم عابدی	۲۷۰۰ روپے
۸۔ ایسکیمو (ناول)	پیٹر فروئے کین، ترجمہ: مسعود اختر	۱۲۵۰ روپے
۹۔ اعمال نامہ	سر رضا علی	۱۵۰۰ روپے
۱۰۔ نواب محبت خاں محبت: احوال و آثار	ڈاکٹر فدا حسین انصاری	۱۳۰۰ روپے
۱۱۔ قواعدِ اردو	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	۷۵۰ روپے
۱۲۔ بوطیقا (اشاعت ہشتم)	ارسطو، ترجمہ: عزیز احمد	۳۰۰ روپے
۱۳۔ جدید اردو شاعری (اشاعت سوم)	عزیز حامد مدنی	۷۰۰ روپے
۱۴۔ اردو تنقید کا ارتقا (اشاعت نہم)	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۸۰۰ روپے
۱۵۔ چند ہم عصر	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	۶۰۰ روپے
۱۶۔ تنقید اور جدید اردو تنقید (اشاعت پنجم)	ڈاکٹر وزیر آغا	۶۰۰ روپے
۱۷۔ اشاریہ 'قومی زبان'	تحقیق و ترتیب: میر حسین علی امام	۷۰۰ روپے
۱۸۔ مکتوباتِ مولوی عبدالحق بنام مشاہیر مع تنقیدی مضامین	میر حسین علی امام/ ڈاکٹر یاسمین سلطانہ فاروقی	۲۴۰۰ روپے
۱۹۔ تہذیبی تنوع اور اردو ناول	ڈاکٹر مہر و نہ لغاری	۱۲۰۰ روپے
۲۰۔ اردو ادب کی تحریکیں (اشاعت دوازدہم)	ڈاکٹر انور سدید	۱۴۰۰ روپے
۲۱۔ اردو ادب میں دہشت گردی کی ارتقائی عکاسی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر ثروت اختر (قرۃ العین طارق)	۲۰۰۰ روپے
۲۲۔ نابغۂ لسان و ادب: محمد شان الحق حقی دہلوی	ڈاکٹر عرفان شاہ	۱۲۰۰ روپے
۲۳۔ جدید اور مابعد جدید تنقید	ڈاکٹر ناصر عباس نیّر	۱۲۰۰ روپے
۲۴۔ اردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی اور سماجی پس منظر	ڈاکٹر رؤف پاریکھ	۱۴۰۰ روپے
۲۵۔ اردو کی ادبی تاریخیں	ڈاکٹر گیان چند	۱۵۰۰ روپے
۲۶۔ اردو اور عالمی صحافت کی ایک نادر تاریخ	ڈاکٹر طاہر مسعود	۲۲۰۰ روپے
۲۷۔ منگل سُوتر (ناول)	پریم چند/ ہندی سے ترجمہ: ڈاکٹر حسن منظر	۶۰۰ روپے
۲۸۔ پریم چند گھر میں	شورانی/ ہندی سے ترجمہ: ڈاکٹر حسن منظر	۲۰۰۰ روپے

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C, Latifabad, Hyderabad.

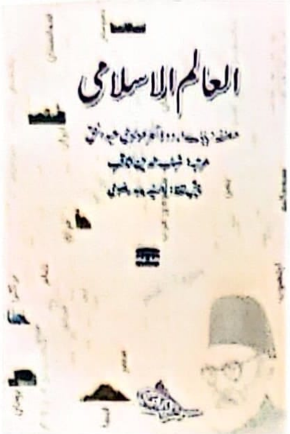
مطبوعات انجمن ترقی اُردو پاکستان



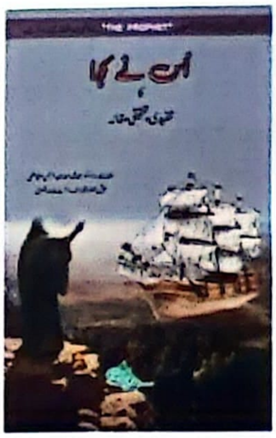
طبع شدہ قیمت: ۱۴۰۰ روپے



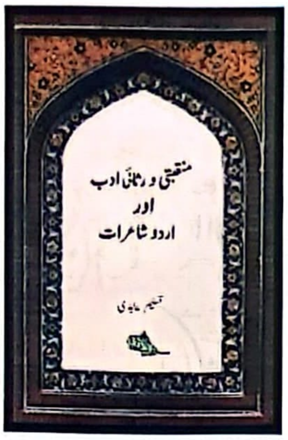
طبع شدہ قیمت: ۳۵۰۰ روپے



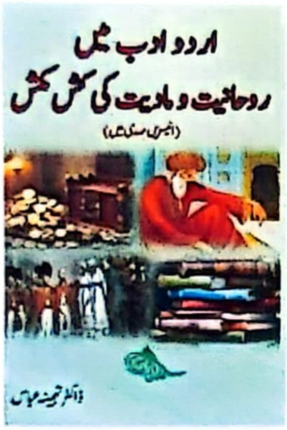
طبع شدہ قیمت: ۸۵۰ روپے



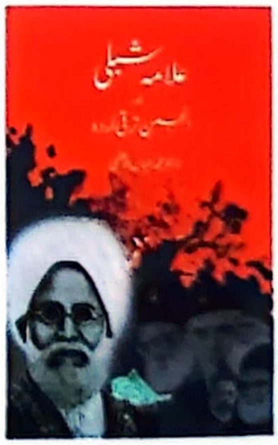
طبع شدہ قیمت: ۷۰۰ روپے



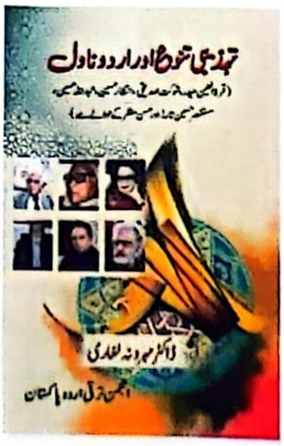
طبع شدہ قیمت: ۲۷۰۰ روپے



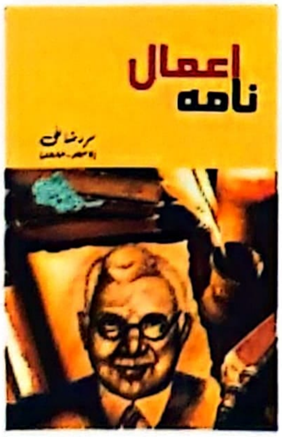
طبع شدہ قیمت: ۱۴۰۰ روپے



طبع شدہ قیمت: ۸۰۰ روپے



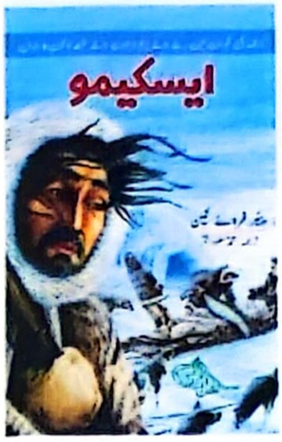
طبع شدہ قیمت: ۱۲۰۰ روپے



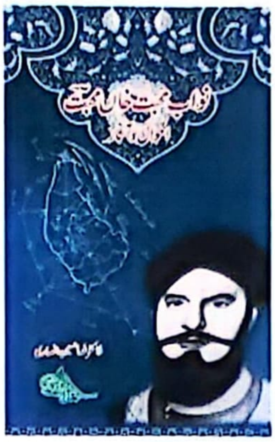
طبع شدہ قیمت: ۱۵۰۰ روپے

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C, Latifabad, Hyderabad.

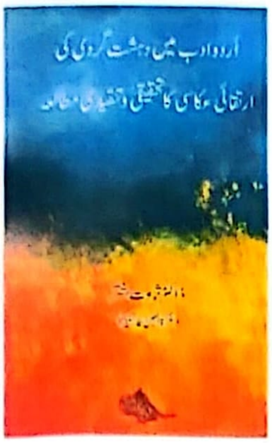
مطبوعات انجمن ترقی اُردو پاکستان



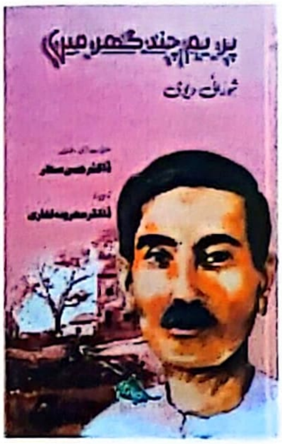
طبع شدہ قیمت: ۱۲۵۰ روپے



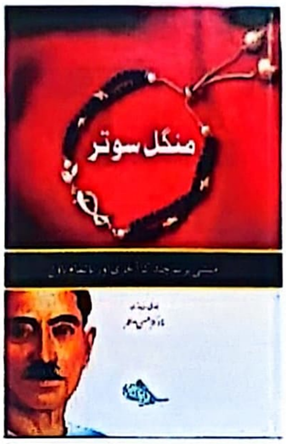
طبع شدہ قیمت: ۱۳۰۰ روپے



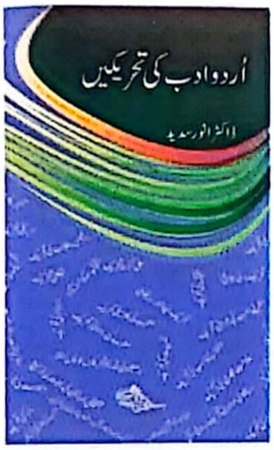
طبع شدہ قیمت: ۲۰۰۰ روپے



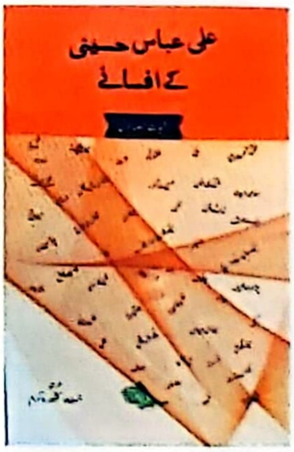
طبع شدہ قیمت: ۲۰۰۰ روپے



طبع شدہ قیمت: ۶۰۰ روپے



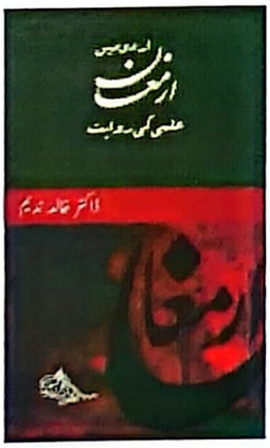
طبع شدہ قیمت: ۱۴۰۰ روپے



طبع شدہ قیمت: ۱۴۰۰ روپے



طبع شدہ قیمت: ۱۵۰۰ روپے



طبع شدہ قیمت: ۱۰۰۰ روپے

SHOUKAT HUSSAIN
ASSISTANT PROFESSOR
Government Ghazali College &
P.G.C, Latifabad, Hyderabad.